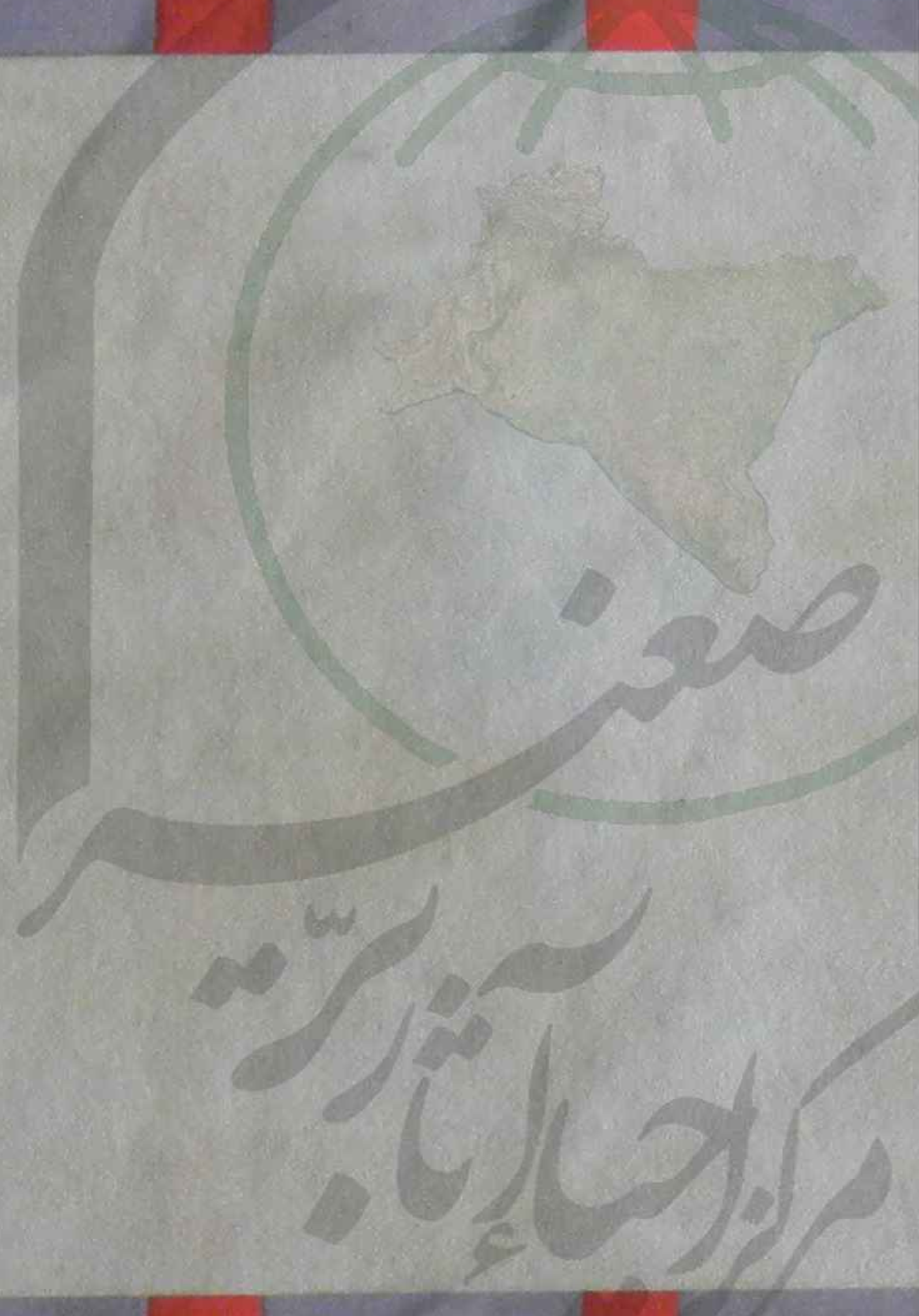
اقبالؔ اور حُبِّ اہلِ بیتِ اطہارؑ





شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز
لاہور - پشاور
حیدر آباد - کراچی

سید محبوب علی زیدی الواسطی سیوہاروی

[illegible]

جناب خطیب پاکستان فخر علماء

سید محمد صاحب دہلوی

کی خدمت میں

"ہدیہ"

"گر قبول افتد زہے عز و شرف"

منجانب: سید محبوب علی زیدی

لیکچرار

۲۰ دسمبر ۱۹۶۶ء

اقبالؒ اور حُبِّ اہلِ بیتؑ اطہار

○

إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ
أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ۝

(پارہ ۲۲ - الاحزاب آیۃ ۳۳)

○

إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَ
عِتْرَتِي أَهْلَ بَيْتِي -

(ترمذی شریف عن جابرؓ بن عبداللہ)

○

مَثَلُ أَهْلِ بَيْتِي كَمَثَلِ سَفِينَةِ نُوحٍ
مَنْ رَكِبَهَا نَجَىٰ وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ -

(مسند خوارزمی عن ابن عباسؓ)

منظور شدہ بحوالہ سرکلر نمبر 54/64-VI(LM) S.O مورخہ ۲ ستمبر سنہ ۱۹۶۴ء
منجانب - ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ . گورنمنٹ آف ویسٹ پاکستان
سول سیکریٹریٹ - لاہور

اقبال اور حُبِّ اہلِ بیتِ اطہارؑ

از

سیّد محبوب علی زیدی الواسطی سیوہاروی

ایم-اے (فارسی)، ایم اے (اردو)، ایم-او-ایل (فارسی)

ڈبلیو-پی-ای-ایس (II)

صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج - علی پور (ضلع مظفر گڑھ)

ناشر

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

لاہور - پشاور - حیدرآباد - کراچی

طابع .... شیخ نیاز احمد

مطبع .... علمی پرنٹنگ پریس - لاہور

تعداد .... ایک ہزار

اشاعتِ اول ۱۹۶۵ء

قیمت .... ۴ روپے



ناشران

شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار، لاہور

انتساب

میں تحقیقِ حق و صداقت کے نقشِ اوّل کو جدِّ امجد

مولانا سیّد آفتاب علی زیدی الواسطی رحمۃ اللہ علیہ

کے نامِ نامی و اسمِ گرامی سے معنوَن کرتا ہوں۔

دل میں ہے مجھ بے عمل کے داغِ عشقِ اہلِ بیتؑ
ڈھونڈتا پھرتا ہے ظلِّ دامنِ حیدرؑ مجھے

(اقبال)

فہرست


MAAB 1431
maablib.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ج

(تسبیح کرتی ہے اللہ کی جو مخلوقات آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے

لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ ز وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

اسی کی ہے حکومت اور اسی کو شایاں ہے سب تعریف اور وہی ہر چیز پر قادر ہے)

(پارہ ۲۸ - سُوْرَۃُ التَّغَابُنِ آیت ۱)

حمد و ثنا خاص اللہ تبارک و تعالیٰ جلّ جلالہ کو سزاوار ہے۔ کہ جس پاک و ستودہ صفات واجب الوجود ذاتِ احدیت نے لفظ کُن سے تمام کائنات کو نیست سے ہست کیا۔ اس رحمٰن و رحیم ہستی نے ممکن الوجود "ماسوا" کو مختلف دوائر میں اس طور پر مسخر کیا کہ ان میں کوئی مہلک تصادم وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ اسی مالک کائنات نے ہمیں اشرف المخلوقات بنا کر اپنا خلیفہ نامزد فرمایا۔ انبیاء کرام و پیغمبران عظام کے ذریعے ہمیں راہِ ہدایت دکھلاتا رہا اور خاتم النّبیین، رحمۃ للعالمین سیدنا و مولانا احمد مجتبیٰ، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے صراطِ مستقیم پر قائم کر کے قرآن کریم عطا فرمایا اور حکم دیا کہ "واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً و لا تفرقوا" (سورہ آل عمران) یعنی اے مسلمانو! اللہ تبارک و تعالیٰ کی رسی

(اسلام) کو سب مل کر پکڑلو اور فرقہ بندی میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ یہ ہماری کج فہمی اور کم علمی ہے کہ ہم نے اس امرِ عظیم کو بھلا دیا اور "امتِ وسطیٰ" کو تہتر فرقوں میں تقسیم کر ڈالا۔ ہماری حرماں نصیبی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اختلافِ امت کو ہم نے رحمت قرار دے رکھا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے !:-

خانہ جنگی کو سمجھتے ہیں بنائے ایمان
مرض الموت ہے جو اُسکو دوا کہتے ہیں

ہر فرقہ حبلِ متین کو چھوڑ کر بزعم خود ناجی ہو چکا ہے۔ اور اپنے اپنے اعمال پر نازاں و فرحاں ہے۔ ہمارے تفرقے نے جہاں ہمیں روحانی بے مائیگی دی ہے وہاں مادی ذلت سے بھی نوازا ہے۔ درحقیقت ہم رسولِ مقبول اور قرآنِ کریم کو چھوڑ چکے ہیں، اوامر و نواہی سے بے بہرہ ہیں اور اعمال میں یہود و نصاریٰ پر بھی بازی لے جا چکے ہیں۔ ہم ان ہی کی طرح دنیا کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس میدان میں بھی ان سے پسماندہ ہی ہیں۔ ہماری تگ و دو مادی ترقی کے لئے وقف ہے۔ اور ہم اللہ تعالےٰ سے ناطہ توڑ چکے ہیں۔ ہمارا رشتہ نفسِ امّارہ سے قائم ہے۔ توحید پرستی کو رخصت کر کے ہم میں سے کوئی تو خواہشاتِ نفسانی کا غلام ہے۔ کوئی مال و منال کا بندہ ہے۔ کسی نے حسن پرستی کو اپنا شعار سمجھا، کوئی ماسوائی طاقتوں کا پرستار بنا، کسی نے خود کو اہل و عیال کا پابند کر رکھا ہے، تو کوئی تہذیب جدید کا پجاری ہے۔ غرضیکہ ہم نے حق پرستی کو چھوڑ کر باطل پرستی اختیار کر لی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ کے آخری حج میں عرفات کے مقام پر خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں ہم سب کی عزت، مال و دولت اور خون ایک

دوسرے پر حرام قرار دیئے۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ ہم نے اس حرمت کو حلت شمار کیا۔ یہ تو مستجاب الدعوات آنحضرت صلعم کی دعا ہے کہ ہم پر امم سابقہ کی طرح کے عذاب نازل نہیں ہو رہے ورنہ ہم نے تو اپنے اعمالِ قبیحہ سے اپنی جانوں کو بد سے بد تر عذاب کا مستحق ثابت کر دکھایا ہے۔

ہمارا اللہ ایک، رسول ایک اور قرآن بھی ایک ہے۔ پس اصولی طور پر ہم سب کو بھی ایک ہی ہونا چاہیئے تھا۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کیا حسبِ حالی فرمایا ہے :-

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں!
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟
کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار؟
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار!
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار؟
ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار؟
قلب میں سوز نہیں، رُوح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں!

چونکہ ہم نے سب ہی کو چھوڑ رکھا ہے۔ لہٰذا ہر شخص کی اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع سے واپسی کے وقت غدیر خم پر تمام صحابہ کو جمع کر کے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:۔

"حمد و ثنا کے بعد، اے لوگو! میں بھی بشر ہوں۔ ممکن ہے کہ خدا کا فرشتہ جلد آ جائے اور مجھے قبول کرنا پڑے (یعنی موت)۔ میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں۔ ایک خدا کی کتاب (جس کے اندر ہدایت اور روشنی ہے۔ خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑو۔ اور دوسری چیز میرے اہلِ بیت ہیں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں خدا کو یاد دلاتا ہوں"

آخری جملے کو آپ نے تین مرتبہ فرمایا۔[۱]

چنانچہ یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ آنحضور صلعم نے ہمیں قرآنِ کریم پر عمل اور اہلِ بیت اطہار سے محبت کا حکم دیا ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبال نے اپنے کلام میں جہاں عشقِ رسول پہ زور دیا ہے وہاں حبِّ اہلِ بیت اطہار کو بھی جزو لاینفک قرار دیا ہے۔ آپ کے کلام میں جہاں آنحضرت صلعم اور اہل بیت علیہم السّلام کی مدح میں گہر ہائے آبدار جا بجا بکھرے پڑے ہیں، وہاں مستقل عنوانات کے

---

[۱] صحیح مسلم باب مناقب علیؑ، ترمذی شریف، نسائیؒ، مسند امام احمد، مسند حاکم وغیرہ۔ نیز سیرت النّبی صلعم از شبلی نعمانی، حصّہ اوّل، صفحہ ۱۶۸، طبع پنجم بحوالہ صحاح ستّہ۔

تحت بھی دُرہائے گرانمایہ سلک ہائے مختلفہ میں منسلک ہیں۔ میں نے اقبال اور اس کے کلام پر شائع ہونے والی کم و بیش تمام کتابیں نظر سے گذاری ہیں مصنّفین و مؤلفین کرام نے کلامِ اقبال کو تقریباً ہر زاویے سے دیکھا اور ہر عنوان کے تحت چھانٹا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ "حُبِّ اہلِ بیت اطہارؑ" کے تحت کوئی مستقل عنوان قائم نہیں کیا۔ اقبالؒ نے آنحضور صلعم سے اہل بیت اطہار کو علیحدہ نہیں کیا۔ لیکن شارحین، ناقدین اور محقّقین نے "پہلے" کو تو قبول کیا، اور "آخری" کو نظر انداز کیے رکھا۔ حالانکہ اہل بیت علیہم السّلام کی منقبت درحقیقت آنحضور صلعم کی مدحت ہی ہے۔ میں وثوق سے کہتا ہوں کہ یہ بات اقبالؒ کی منشا سے مطابقت نہیں کرتی کہ آنحضرت صلعم کے ذکر کے ساتھ اہل بیت اطہار کا ذکر نہ کیا جائے۔

جناب رئیس احمد صاحب جعفری نے "اقبال اور عشقِ رسول" لکھ کر اقبالیات میں فی الواقعہ ایک گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ ان کی قابلِ قدر تصنیف کے مطالعے سے ہی میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اقبال نے جو گہرہائے عقیدت اہلِ بیت اطہارؑ کی خدمت میں پیش کئے ہیں انہیں یکجا کر کے اہلِ دانش و بینش کے سامنے پیش کروں تاکہ ان کے نشر سے جہاں اقبالؒ کو ثواب پہنچے وہاں میں بھی زادِ راہِ آخرت کما سکوں۔ چونکہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم مالکِ بیتِ نبوّت ہونے کی حیثیت سے اہل بیت اطہار سے الگ نہیں ہیں، اسی لیے میں جرأتِ رندانہ کرتے ہوئے جعفری صاحب سے معذرت کے ساتھ اقبال اور عشقِ رسول کو بھی اجاگر کروں گا۔

بفضلِ خدا میری یہ انتہائی کوشش رہی ہے کہ جو کچھ بیان کیا جائے وہ قرآنِ کریم

احادیث شریف اور معروف علما کی تصانیف سے نقل ہو تاکہ اعتراضات کی گنجائش نہ نکل سکے۔ نیز میں ہرگز نہیں چاہتا کہ میرے قلم سے مسلمانوں کے کسی فرقے کی دِل آزاری ہو۔ بقول حافظ شیرازی میرا یہی مسلک ہے اکہ ؎

مباش درپئے آزار و ہرچہ خواہی کن
کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

اللہ تبارک و تعالےٰ سے عاجزانہ دعا ہے کہ وہ بزرگ و برتر ذات میری اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس تصنیف کو مسلمانوں کے متحد کرنے کی کوششوں و کاوشوں کے سلسلے کی ایک کڑی بناتے ہوئے اتحادِ ملت کی راہ میں سنگِ میل کی حیثیت عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین یا ربّ العالمین!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

مُحِبِّ شافعِ روزِ جزا

سیّد محبوب علی زیدی الواسطی سیوہاروی

بتاریخ ۱۸ دسمبر ۱۹۶۴ء بروز جمعۃ المبارک

علی پور (ضلع مظفر گڑھ)

تعارفِ اقبالؒ

ہیچکس رازے کہ من گویم نگفت
ہمچو فکرِ من دُرِّ معنی نسفت
(اقبالؒ)

حکیم الاُمت ڈاکٹر سر محمد اقبال ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء بمقام سیالکوٹ کتمِ عدم سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔ آپ کے والدِ گرامی نور محمد تھے، جو با اخلاق، نیک سیرت اور صوفی مشرب انسان تھے۔ آپ کی والدہ محترمہ بڑی عابدہ و زاہدہ تھیں۔ جنہوں نے بڑی توجہ سے آپ کی پرورش کی۔ علامہ فرماتے ہیں:

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

قدیم رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر ہی پائی۔ پھر مکتب میں زیرِ تعلیم رہے اور بعدہٗ سیالکوٹ میں ہی مشن ہائی سکول میں داخل ہو گئے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"۔ آپ بچپن ہی سے بڑے

ذہین وفہیم تھے۔ چنانچہ امتحانات میں امتیازی حیثیت حاصل کرتے ہوئے ۱۸۹۳ء میں مرے کالج، سیالکوٹ میں داخل ہوئے۔ ان دنوں وہاں عربی کے پروفیسر مولوی میر حسن تھے، جو عربی اور فارسی کے متبحر عالم تھے۔ علامہ اقبالؒ نے آپ کی زیر سرپرستی عربی وفارسی میں دسترس حاصل کی۔ شعر وسخن کا ذوقِ سلیم بھی آپ کی تعلیم اور فیضِ صحبت کا نتیجہ تھا۔ آپ کو اپنے محترم استاد سے والہانہ محبت تھی۔ چنانچہ جب آپ انگلستان روانہ ہونے لگے تو "التجائے مسافر" (بدرگاہ حضرت نظام الدین اولیا) کے عنوان سے ایک نظم لکھی، جس میں آپ اُن کے احسانات کے دل سے معترف نظر آتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جسکا آستاں مجکو

نفس سے جسکے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جسکی مروت نے نکتہ داں مجکو

دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان وزمیں
کرے پھر اُسکی زیارت سے شادماں مجکو

فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب اپنے گرامی قدر استاد سے مشورے لیتے رہے۔ مرے کالج، سیالکوٹ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ لاہور تشریف لے گئے اور گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا، چنانچہ ۱۸۹۹ء میں ایم اے فلسفہ کا امتحان نمایاں امتیاز سے پاس کیا، اور آپ کو اوّل آنے کی بنا پر طلائی تمغہ بھی ملا۔

مولوی میر حسن کی طرح پروفیسر آرنلڈ بھی اقبال کے محسن اور شفیق استاد تھے۔ آپ نے علامہ میں علمی ذوق پیدا کیا اور سنہ ۱۹۰۴ء میں اپنے وطن کی طرف مراجعت کر گئے۔ چنانچہ آپ نے "نالۂ فراق" کے عنوان سے ایک نظم لکھی، جس میں ان کے فیضانِ صحبت کا بخوبی اعتراف کیا۔ لہٰذا فرماتے ہیں:۔

تو کہاں ہے، اے کلیمِ ذروۂ سینائے علم!
تھی تری موجِ نفس، بادِ نشاط افزائے علم
اب کہاں، وہ شوقِ رہ پیمائیٔ صحرائے علم!
تیرے دم سے تھا، ہمارے سر میں بھی سودائے علم
"شورِ لیلیٰ کو، کہ باز آرائشِ سودا کند
خاکِ مجنوں را غبارِ خاطرِ صحرا کند"

ایم اے کر کے علامہ اقبال نے ملازمت کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا اور اورینٹل کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ بعدہٗ وہاں سے ملازمت ترک کر کے گورنمنٹ کالج میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ملک کی خدمت کرنے لگے۔ علم کی تشنگی اور پروفیسر آرنلڈ سے کیے ہوئے وعدے نے آپ کو بے چین کیے رکھا۔ آخر کار "دستِ وحشت" نے "عقدۂ تقدیر" کو کھول دیا۔ اور آپ "پنجاب کی زنجیر" توڑ کر سنہ ۱۹۰۵ء میں عازمِ انگلستان ہوئے۔ وہاں آپ نے کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفۂ اخلاق کی ڈگری حاصل کی، میونخ یونیورسٹی، جرمنی سے "ایران میں فلسفۂ مابعد الطبیعیات کا ارتقاء" کے عنوان سے مقالہ سپردِ قلم کرنے پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی اور اسی سہ سالہ قیام میں

بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔

اقبال کو انگلستان کے قیام سے بہت فائدے پہنچے۔ وہاں آپ نے یورپی تہذیب کا بنظرِ غائر مشاہدہ کیا، نیز اس نئی تہذیب کے اصول وضوابط کو جانچا اور پرکھا۔ "ایران میں فلسفۂ مابعد الطبیعیات" پہ مقالہ لکھنے کے سلسلے میں آپ کو قرآنِ کریم، کتب احادیث اور تصوف پر مختلف تصانیف کا دقیق النظری سے مطالعہ کرنا پڑا، جو آپ کے ذہن کو مشرقی خطوط پر استوار کرنے کا سبب بنا۔ شیخ عبد القادر مرحوم لکھتے ہیں کہ اقبال نے اپنے اسی قیامِ یورپ کے دوران میں ان کے سامنے شاعری کو ترک کر دینے کا اظہار کیا، لیکن ان کی شدید مخالفت کی وجہ سے یہ معاملہ پروفیسر آرنلڈ کی رائے کو قطعی اور حتمی قرار دے کر ان پر چھوڑ دیا گیا۔ چنانچہ جب انھوں نے عبد القادر صاحب سے اتفاق رائے کیا، تو فیصلہ یہی ہوا کہ اقبال کے لئے شاعری کو ترک کرنا جائز نہیں۔ جو وقت وہ اس شغل میں صرف کرتے ہیں وہ ان کے لئے مفید ہے۔ اور ملک و قوم کے لئے بھی بے حد سود مند ہے۔ اقبال نے شاعری شروع تو کر دی، لیکن چند در چند وجوہات کی بنا پر اردو زبان کی جگہ فارسی زبان کو اپنا ذریعۂ اظہارِ خیال بنا لیا۔ اس سلسلے میں شیخ عبد القادر مرحوم لکھتے ہیں "فارسی میں شعر کہنے کی رغبت اقبال کی طبیعت میں کئی اسباب سے پیدا ہوئی ہوگی، اور میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اپنی کتاب میں حالاتِ تصوف لکھنے کے لئے جو کتب بینی کی، اس کو بھی ضرور اس تغیرِ مذاق میں دخل ہوگا اس کے علاوہ جوں جوں ان کا مطالعہ علم فلسفہ کے متعلق گہرا ہوتا گیا اور دقیق

خیالات کے اظہار کو جی چاہا، تو انہوں نے دیکھا کہ فارسی کے مقابلے میں اردو کا سرمایہ بہت کم ہے، اور فارسی میں کئی فقرے، اور جملے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایسے ملتے ہیں جن کے مطابق اردو میں فقرے ڈھالنے آسان نہیں۔ اس لئے وہ فارسی کی طرف مائل ہو گئے۔ مگر بظاہر جس چھوٹے سے واقعے سے ان کی فارسی گوئی کی ابتدا ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک دوست کے ہاں مدعو تھے، جہاں ان سے فارسی اشعار سنانے کی فرمائش ہوئی اور پوچھا گیا کہ وہ فارسی شعر بھی کہتے ہیں یا نہیں؟ انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ انہوں نے سوائے ایک آدھ شعر کے کبھی فارسی لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر کچھ ایسا وقت تھا کہ اس فرمائش نے ایسی تحریک ان کے دل میں پیدا کی کہ دعوت سے واپس آ کر بستر پر لیٹے ہوئے باقی وقت وہ شاید فارسی اشعار کہتے رہے، اور صبح اٹھتے ہی جب مجھ سے ملے تو دو تازہ غزلیں فارسی میں تیار تھیں، جو انہوں نے زبانی مجھے سنائیں۔ ان غزلوں کے کہنے سے انہیں اپنی فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا جس کا پہلے انہوں نے اس طرح امتحان نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد ولایت سے واپس آنے پر گو کبھی اردو کی نظمیں بھی کہتے تھے، مگر طبیعت کا رخ فارسی کی طرف ہو گیا تھا۔"

علامہ اقبال ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو انگلستان سے دہلی ہوتے ہوئے لاہور پہنچے اور دوبارہ گورنمنٹ کالج میں ملازم ہو کر فلسفے کے پروفیسر اعلیٰ کے عہدے کو سنبھال لیا، مگر ڈیڑھ سال بعد وہاں سے سبکدوش ہو کر بیرسٹری شروع کر دی ۱۹۱۷ء میں سر اکبر حیدری نے آپ کو قانون کی پروفیسری کے لیے حیدرآباد

بلایا مگر آپ نے یہ پیشکش مسترد کر دی۔ ۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ کی طرف سے
آپ کو "سر" کا خطاب ملا۔

ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۲۶ء سے سیاسیات میں حصہ لینا شروع کیا، اور لیجسلیٹو کونسل کی ممبری کے لئے کھڑے ہوئے۔ آپ نے مدِمقابل کو الیکشن میں شکستِ فاش دے کر نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسے کی صدارت کے فرائض سرانجام دیئے. اور ۱۹۳۱ء میں آپ دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے انگلستان تشریف لے گئے۔ آپ نے ۱۹۳۲ء میں دوبارہ تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلستان کا سفر اختیار کیا، اور واپسی پر سپین ہوتے ہوئے آئے۔ ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ کی دعوت پر افغانستان تشریف لے گئے۔ آپ ۱۹۳۵ء میں پنجاب کی صوبائی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے لیکن علالت نے قوم کی عملی خدمت کا موقع نہ دیا۔ حج بیت اللہ کی آرزو عرصہ دراز سے تھی۔ لیکن چند در چند وجوہات کی بنا پر اسے عملی جامہ نہ پہنا سکے، اور اسی آرزو کو دل ہی میں لئے ۲۱۔اپریل ۱۹۳۸ء کو اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف مراجعت فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

آپ شاہی مسجد کے باہر ملحقہ باغ میں دفن ہوئے۔

انتقال سے چند منٹ قبل اس ترجمانِ حقیقت کی زبان پر مندرجہ ذیل
رباعی تھی:-

سُرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟ نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سرآمد روزگارِ ایں فقیرے دِگر دانائے راز آید کہ ناید؟

آپ کی وفاتِ حسرت آیات نے ادبی اور سیاسی دنیا میں قیامت برپا کر دی۔ پروفیسر حامد حسن قادری نے تاریخ وفات کہی فرماتے ہیں:۔

؎ برفت اقبال آں عرفاں نوائے ۱۳۳۵
دِگر دانائے راز آید کہ ناید ۶۰۳ / ۱۹۳۸

ملک کے راہنماؤں نے بھی غم و اندوہ کا اظہار کیا۔ چنانچہ قائد اعظم محمد علی جناح، رابندر ناتھ ٹیگور اور حسرت موہانی نے آپ کے پسماندگان کو تعزیت نامے ارسال کئے۔

اقبال سادہ لباس زیب تن کئے رہتے تھے۔ آپ بڑے خلیق اور ملنسار تھے۔ بزرگوں کی عزت اور بچوں پر شفقت کرتے تھے۔ ملازمین سے برابری کا برتاؤ کرتے۔ بڑے خوش طبع انسان تھے۔ گفتگو ہمیشہ ہلکے پھلکے انداز اور دل نشیں پیرائے میں کرتے۔ اندازِ بیان اکثر و بیشتر شگفتہ ہوتا تھا۔ ہر بات میں مزاح کا پہلو نکال لیتے تھے۔ صابر و شاکر تھے اور قناعت نے آپ کو سکونِ قلب عطا کیا تھا۔ لہٰذا ہر حال میں خوش و خرم نظر آتے۔ قرآن کریم سے بے حد محبت تھی۔ عموماً خوش الحانی سے بآوازِ بلند تلاوت کیا کرتے تھے۔ دورانِ تلاوت آیاتِ قرآنی پر فکر و تدبر کرتے اور اکثر متاثر ہو کر بے اختیارانہ آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ آپ قرآنِ کریم پر عمل کو ہی ذریعہ نجات سمجھتے تھے، چنانچہ فرمایا ہے:۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

علامہ اقبال حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ محبت رکھتے تھے، نیز آپ کی ذاتِ بابرکات کو تمام کمالات کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ فرمایا ہے :-

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بو لہبی است

آپ کو اہل بیت نبی صلعم سے بے پناہ عقیدت تھی۔ چنانچہ انکی منقبت میں بہت کچھ کہا ہے مثلاً :-

دل میں ہے مجھ بے عمل کے داغ عشق اہلِ بیت
ڈھونڈتا پھرتا ہے ظلِ دامنِ حیدرؑ مجھے

اولیاء اللہ سے خاص تعلق خاطر تھا۔ حضرت نظام الدین اولیا سے تو بے پناہ محبت تھی۔ چنانچہ انگلستان جاتے ہوئے بھی آپ کے مزار پر حاضری دی۔ اور واپس آتے ہی مزار مبارک پر حاضر ہوئے۔ غرضیکہ اقبالؒ اللہ والے اور اللہ والوں والے تھے۔

علامہ اقبال کی شاعری کے چار دور ہیں :-

پہلا دور ابتدا سے سنہ ۱۹۰۴ء تک ہے۔ اس زمانے میں آپ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ فطرت کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ ہے یہ نیچرل شاعری ورڈسورتھ کی شاعری سے مماثلت رکھتی ہے۔ اس دور میں ہم

انہیں معلم اخلاق بھی پاتے ہیں۔ آپ نظریہ وطنیت کے محدود دائروں میں گرفتار بھی ہیں۔ چنانچہ ترانۂ ہندی، نیا شوالہ، میرا وطن، اس رجحان کی بیّن مثالیں ہیں۔ اسی زمانے میں آپ حکمت، فلسفہ اور تصوف کی مبادیات بھی بیان کرنے لگے تھے۔

دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک ہے۔ یہ عرصہ یورپ کے قیام کا زمانہ تھا۔ وہاں آپ نے فلسفے کا مطالعہ کیا۔ اہل یورپ کی خوشحالی اور اہل ہند کی زبوں حالی کا بیّن بُعد ملاحظہ کرتے رہے اور ہندوستانیوں کے علمی، اخلاقی، تہذیبی، مذہبی اور معاشرتی انحطاط سے یہاں تک مایوس ہوئے کہ اپنی شاعری کو فعلِ عبث قرار دے کر اسے خیرباد کہنے پر آمادہ ہوئے اور کہا:۔

مدیرِ مخزن سے جا کے اقبال، کوئی میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں، انہیں مذاق سخن نہیں ہے

لیکن آرنلڈ کی اس معاملے میں مداخلت اور اس سلسلے میں گراں قدر مشورے سے آپ نے دوبارہ کمرِ ہمت باندھ لی۔ اس زمانے میں حسن و عشق کا مطالعہ، جدوجہد پیہم کے نتائج کا مشاہدہ اور مادہ پرستی سے انحطاطِ اقدارِ روحانی کا احساس آپ کے اکتسابات فاضلہ ہیں۔ دورِ سابقہ اور اس دور کا کلام آپ نے خود انتخاب کر کے بانگِ درا میں شامل کیا تھا۔ اسی زمانے میں آپ فارسی گوئی کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔

تیسرا دور ۱۹۰۹ء سے شروع ہو کر ۱۹۲۴ء تک منتہی ہوتا ہے۔ یہ دور یورپ سے واپسی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے میں آپ وطنیت

کی محدود فضاؤں سے نکل کر ملی اخوت کی حقیقت کو پا گئے ہیں۔ آپ نے مسلمانوں کو ان کے برگزیدہ اور اولوالعزم اسلاف کے کارنامے سنا کر انہیں خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی۔ علاوہ ازیں اپنی قوم کو تہذیب جدید کے خطرات سے بھی خبردار کیا۔ درحقیقت آپ نے جہاں قوم کی درماندگی کی عکاسی کی ہے وہاں اسے امید کی راہ بھی دکھائی ہے۔ اس زمانے میں آپ نے اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی اور پیام مشرق کے زیر عنوان تین مثنویاں بزبانِ فارسی لکھیں اور ایک مفکّر کی حیثیت سے "خودی" کے رازِ سربستہ کو بے نقاب کیا۔

اقبال کی شاعری کا چوتھا اور آخری دور ۱۹۲۵ء سے شروع ہو کر ۱۹۳۸ء میں آپ کی وفات کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ زمانہ فلسفہ، تصوّف نفسیات، اخلاقیات کے مسائل کا تکملہ ہے۔ یہاں آپ آفاقی شعرا کی صف میں نمایاں مقام پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اس دور میں آپ حکمت کلیمی اور حرّیت کے مبلغ، مذہب کے پرچارک، نیز سیاسی اور عمرانی مسائل کے عقدہ کشا نظر آتے ہیں۔ اردو میں بالِ جبریل، ضربِ کلیم، ارمغانِ حجاز کا ایک حصّہ اور فارسی میں پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق، زبورِ عجم، مسافر، جاوید نامہ اور ارمغانِ حجاز (حصہ فارسی) کے مجموعے انہی اہم مسائل سے بھرے پڑے ہیں۔ درحقیقت یہی زمانہ آپ کی شاعری کی معراج ہے اور آپ کے شعر و سخن کے کمالات آپ کو اقلیم شاعری کا پیغمبر قرار دیتے ہیں۔

علامہ اقبال کی نثری تصنیفات میں اردو تصنیف "علم الاقتصاد"،

اور انگریزی تصانیف ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر، ایران میں فلسفۂ مابعد الطبیعیات کا ارتقا، اسلام کا مذہبی تخیّل بڑی معرکۃ الآرا کتابیں ہیں۔ اردو میں آپ کے منظوم مجموعے بانگِ درا، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم ہیں۔ فارسی میں اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق، زبورِ عجم (مع گلشنِ رازِ جدید و بندگی نامہ) جاوید نامہ، پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق (مع مسافر) اور ارمغانِ حجاز ہیں۔ ارمغانِ حجاز کا ایک حصہ اردو میں بھی ہے۔

اقبال کی شاعری درحقیقت ملّی شاعری ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آپ کا کلام مقبولِ خاص و عام ہوا۔ آپ نے ملّتِ اسلامیہ کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لئے خوب ہی جھنجھوڑا۔ مسلمانوں کو خودی کی تعلیم دی تاکہ وہ اپنی زندگی کو مضبوط بنیادوں پر استوار کریں۔ اور اسلام کی حفاظت سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کریں۔ آپ کے نزدیک استحکامِ خودی نصب العینِ زندگی ہے۔ اور رضائے الٰہی کا حصول مقصدِ حیاتِ انسانی ہے جو بدون استحکامِ خودی ناممکن ہے۔ خودی کا سبق ہی وہ سربستہ راز اور نادر نکتہ ہے جس کے انکشاف پر آپ نے دعویٰ کیا ہے:۔

ہیچکس رازے کہ من گویم نگفت ۵
ہمچو فکرِ من دُرِ معنی نہ سُفت

کوئی قوم خودی کا ادق سبق مختصر وقت میں ازبر نہیں کر سکتی۔ اس سبق کو یاد کرنے اور اس پر عمل کرکے خودی کو پالینے کی مہم "جوئے شیر" لانے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ چنانچہ اس کے حصول کے لئے مسلسل جدوجہد لازمی ہے تب

جا کر کہیں وہ مقصد ہاتھ آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے شاعرِ مستقبل ہونے کا دعوےٰ کیا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم
من نوائے شاعرِ فرداستم
عصرِ من دانندۂ اسرار نیست
یوسفِ من بہر ایں بازار نیست

مرزا غالب کو بھی قبولِ عام ان کی وفات کے بعد ملا۔ علامہ اقبال کے پیش کردہ "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" کے مسائل کو بھی بہتر طریق پر بعد کے لوگوں نے ہی سمجھا اور آپ کے کلام سے عملی طور پر فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ پاکستان کا حصول بھی انہی حاصل کیئے گئے فائدوں میں سے ایک ہے۔ جب تک اقبال زندہ رہے مختلف حلقے ان پر لے دے کرتے رہے۔ ہاں آپ کی اس دارِ فانی سے رحلت کے بعد عوام وخواص، ہر دو نے آپ کے کلام سے خوب اعتنا کی۔ ناقدین اور محققین نے آپ کی شاعری کے تمام پہلو نمایاں کیئے۔ آپ کے کلام کی خوبیاں اُجاگر کیں اور آپ کی شاعرانہ عظمت کو دلائل و براہین سے مستحکم اور مُسلّم قرار دیا۔ بّرِصغیر پاک وہند کے تمام شعراء میں آپ پر جس قدر کام ہوا ہے، کسی دوسرے پر نہ تو ہوا ہے اور نہ ہی ہونے کی امید ہے۔ اس حقیقت کو آپ نے بھی پا لیا تھا۔ لہٰذا اپنی دُور اندیشی کی بنا پر پیش گوئی بھی فرمادی تھی، کہ :۔

۵ پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

اقبال نے اولیاء اللہ کی تصانیف کا بھی دقیق النظری سے مطالعہ کیا تھا، جس کا ثبوت آپ کے کلام سے ملتا ہے۔ آپ نے اس حقیقت کا اقرار بھی کیا، جیساکہ فرمایا ہے ؎

نہ از ساقی نہ از پیمانہ گفتم
حدیثِ عشق بے باکانہ گفتم
شنیدم آں چہ از پاکان امّت
ترا با شوخیٔ رندانہ گفتم

آپ کے کلام میں تاثیر اسی وجہ سے پیدا ہوئی کہ آپ نے اولیاء اللہ سے استفادہ کیا۔ چنانچہ وسعتِ تاثر کے اعتبار سے آپ عظیم عالمی شعرا کی صف میں امتیازی شان سے کھڑے نظر آتے ہیں۔

اقبال ایک عظیم شاعر اور مفکر ہیں۔ آپ کا فارسی کلام بھی نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ آپ کی فارسی غزل میں بعض اوقات حافظؒ اور سعدیؒ کی غزلوں جیسی روانی پائی جاتی ہے، اور اگر تفحّص سے کام لیا جائے تو بعض اشعار تو ایسے بھی ملیں گے کہ نفسِ مضمون اور تاثیر کے اعتبار سے جن کے ہم عیار اشعار فارسی غزل گو اساتذہ کے کلام میں بھی بڑی جانکاہی کے باوجود شاید ہی مل سکیں مشتے از خروارے مندرجہ ذیل اشعار امتیازی شان کے حامل ہیں:۔

۵ کجا نوری کہ غیر از قاصدی چیزے نمی داند
کجا خاکی کہ در آغوش دارد آسمانے را

---

۵ اگر یک ذرہ کم گردد ز انگیزِ وجودِ من
بایں قیمت نمی گیرم حیاتِ جاودانی را

---

۵ دی مغ بچۂ با من اسرارِ محبت گفت
اشکے کہ فرد خوردی از بادۂ گلگوں بہ

ملاحظہ کیجیے کہ ان اشعار میں ہر شعر وسیع معانی اور عمیق مطالب کا حامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے شعر کیا کہے ہیں، بس یہ سمجھئے کہ دریاؤں کو کوزوں میں بند کر دیا ہے۔ ایسے اعلےٰ اور معیاری اشعار فارسی غزل گو اساتذہ کے ہاں بھی خال خال ہی ملیں گے۔ جہاں تک مثنوی نگاری کا تعلق ہے۔ آپ کی مثنویاں "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" معانی و مطالب کے لحاظ سے عطار کی معرکتہ الآرا مثنوی "منطق الطیر" اور سنائی کی شاہکار تصنیف "حدیقہ" سے کم نہیں ہیں۔ کیوں نہ ہو مولانا روم جیسے غائبانہ رشتۂ تلمذ جوڑا۔ جن کی مثنوی کو اساتذۂ زمانہ "قرآن در زبان پہلوی" کہتے آئے ہیں۔ آقائے محترم سید علی داعی الاسلام، پروفیسر فارسی نظام کالج، حیدرآباد دکن نے اقبال کی فارسی شاعری پر اپریل ۱۹۲۸ء میں لیکچر دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ اقبال کا رنگ غالب کے رنگ سے بہت ملتا ہے غالب کے بعد چشم ہندوستان اقبال کی وجہ سے پُر نور ہے۔ کسی قدیم استاد نے

اساتذہ کی جانشینی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کو اس طرح ختم کیا ہے کہ:۔

ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید
بہ جامی سخن را تمامی رسید

غالب نے اس پر اس شعر کا اضافہ کیا تھا: ؎

ز جامی بہ عرفی و طالب رسید
ز عرفی و طالب بہ غالب رسید

چنانچہ آغا شاعر مکرم نے مندرجہ ذیل دو شعروں کا اضافہ کیا:۔

چو غالب ز ہندوستاں رخت بست
بجائے وے اقبالِ دانا نشست
یقیں داں سخن دانیٔ باستاں
بماند بہ ہندوستاں جاوداں

بقول آپ کے اگر اقبال ایران میں ہوتے اور فارسی زبان میں وطنی شعر کہتے تو وہاں کے مشہور اساتذہ کی صف میں جگہ پاتے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اقبال کی فارسی دانی ایرانیوں تک کے نزدیک مسلّم ہے۔

آپ کے اردو کلام میں آپ کی نظمیں مثالی حیثیت کی حامل ہیں۔ اس صنف کے حقیقی موجد اور خاتم آپ ہی ہیں۔ خصوصیت اور تاثیر کے اعتبار سے ان نظموں کا مقابلہ دوسرے شعراء کی بہت کم نظمیں کر سکیں گی۔ آپ کی اردو غزلیں تصوف اور فلسفے کے مسائل سے بھرپور ہیں۔ رفعتِ تخیل میں آپ غالب کے رتبے تک جا پہنچتے ہیں۔ اور اثر میں میر تقی میر کے

ساتھ ساتھ ہیں۔ مولانا حامد حسن قادری نے کیا خوب کہا ہے ؎

تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے
جن کے فیضِ طبع نے اردو کو گنجِ زر دیا
اِک اثر میں بڑھ گیا، اِک رفعتِ تخئیل میں
تیسرے کی ذات میں دونوں کو حق نے بھر دیا
کائناتِ شاعری میں بس یہی دونوں کمال
تیسرے میں اس لئے دونوں کو یکجا کر دیا

اقبال کی اردو غزلوں میں بھی معانی و مطالب کے لحاظ سے بہت سے اشعار بڑے بلند پایہ ہیں، جن میں بیکراں وسیع مسائل کو کوزوں میں بند کر رکھا ہے، مثلاً:

؎ مٹے یقیں سے ضمیرِ حیات ہے پُرسوز
نصیبِ مدرسہ یا رب یہ آبِ آتشناک!

؎ زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک!

؎ حدِ ادراک سے باہر ہیں باتیں عشق و مستی کی
سمجھ میں اسقدر آیا کہ دل کی موت ہے دوری!

ے
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من!

ے
یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری کی حیات
خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دُور نہیں!

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اقبال کا کلام علوئے تخیل، بلندیٔ تخیل، پاکیٔ مضمون، صفائیٔ تراکیب، خوبیٔ استعارات، افراط و لطافتِ تشبیہات، موزونیٔ مطالب و معانی، برجستگیٔ تلمیحات، مصوریٔ محاکات اور جوششِ بیان کے اعتبار سے تمام شاعرانہ کمالات کا حامل ہے۔ اب رہا زبان و بیان کی غلطیوں کا سوال تو سوائے کلام اللہ اور ارشاداتِ نبی صلعم کے کس کا کلام سہو سے پاک ہو سکتا ہے۔ انسان خطا و نسیان کا پتلا ہے۔ بعض تخریب پسند عناصر اقبال کے کلام کی خوبیوں اور کمالات سے صرفِ نظر کر کے "تو تُو دی پو ہنیز" کی قبیل کے معمولی اعتراضات کو لئے پھرتے ہیں، اور یہ نہیں سمجھتے کہ "اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ" (تحقیق نیکیاں برائیوں کو دھو ڈالتی ہیں)۔ آخر اقبال بھی انسان ہی تھے۔ یہ معمولی غلطیاں ان کے گرانقدر بلند پایہ کلام کے لئے خالِ رُخِ زیبا، یا نظرِ بد سے محفوظ رکھنے کا "سیاہ نشان" ہیں۔ لہٰذا اُن سے اغماض ہی قرینِ صواب اور حقیقی نیکی ہے۔ میں مضمون ہذا کو علامہؒ کے اس شعر پر تمام کرتا ہوں: ے

بے نیازانہ زِ شوریدہ نوایم مگذر ۔۔۔ مُرغِ لاہوتم و از دوستِ پیامے دارم

معرفتِ اہل بیت اطہار علیہم السلام

اِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ

بیشک چاہتا ہے اللہ تو یہی کہ دور کر دے تم سے ناپاکی

اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ۝

اے اہلبیت (نبیؐ) اور پاک کر دے تمہیں پوری طرح پاک کرنا

(الاحزاب آیت ۳۳)

مسند احمد میں ہے کہ حضرت اُمّ سلمہؓ فرماتی ہیں کہ حضور صلعم میرے گھر میں تھے کہ حضرت فاطمہ حریرے کی ایک پتیلی بھری ہوئی لائیں۔ آپ نے فرمایا کہ اپنے میاں کو اور اپنے دونوں بچوں کو بھی بلا لو۔ چنانچہ وہ بھی آگئے اور کھانا شروع ہوا آپ اپنے بستر پر تھے۔ خیبر کی ایک چادر آپ کے نیچے بچھی ہوئی تھی۔ میں حجرے میں نماز ادا کر رہی تھی کہ یہ آیت اتری۔ پس حضورؐ نے انہیں چادر اڑھادی اور چادر میں سے ایک ہاتھ نکال کر آسمان کی طرف اٹھایا اور یہ دعا کی کہ الٰہی یہ میرے اہل بیت اور حمایتی ہیں، تو ان سے ناپاکی دور کر اور انہیں طاہر کر۔ میں نے اپنا سر گھر میں سے نکال کر کہا۔ یا رسول اللہ! میں بھی آپ سب کے ساتھ ہوں۔ آپ نے فرمایا، یقیناً تو بہتری کی طرف ہے

فی الواقع تو خیر کی طرف ہے"۔ دوسری سند سے ام سلمہؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ ان کے سامنے حضرت علیؑ کا ذکر آیا، تو آپ نے فرمایا "آیت تطہیر تو میرے گھر میں اُتری ہے۔ آپ میرے ہاں آئے اور فرمایا، کسی اور کو آنے کی اجازت نہ دینا۔ تھوڑی دیر ہوئی تو حضرت فاطمہؑ آئیں۔ اب بھلا میں بیٹی کو باپ سے کیسے روکتی۔ پھر حسنؑ آئے، تو اسے نانا سے کون روکے۔ پھر حضرت حسینؑ آئے میں نے انہیں بھی نہ روکا۔ پھر حضرت علیؑ آئے، انہیں بھی نہ روک سکی۔ جب یہ سب جمع ہو گئے تو جو چادر حضرت صلعم اوڑھے ہوئے تھے اس میں ان سب کو لے لیا اور کہا، الٰہی! یہ میرے اہل بیت ہیں۔ ان سے پلیدی دُور کر دے اور انہیں خوب پاک کر دے۔ پس یہ آیت اُس وقت اتری جب یہ چادر پر جمع ہو چکے تھے۔ میں نے کہا، یا رسول اللہ! میں بھی؟ لیکن اللہ جانتا ہے کہ آپ اس پر خوش نہ ہوئے اور فرمایا، تو خیر کی طرف ہے"۔

مسلم شریف میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضور سیاہ چادر اوڑھے ہوئے ایک دن صبح ہی صبح نکلے اور ان چاروں کو اپنی چادر تلے لے کر یہ آیت پڑھی۔ ابن ابی حاتم حضرت عائشہؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ اُن سے کسی نے حضرت علیؑ کے بارے میں سوال کیا، تو آپ نے فرمایا "وہ سب سے زیادہ رسول اللہ صلعم کے محبوب تھے اُن کے گھر میں آپ کی صاحبزادی تھیں، جو سب سے زیادہ آپ کی محبوب تھیں"۔ پھر چادر کا واقعہ بیان کر کے فرمایا "میں نے قریب جا کر

کہا، یا رسول اللہ! میں بھی آپ کے اہل بیت سے ہوں؟" فرمایا، "دور رہو۔ تم یقیناً خیر پہ ہو۔

ابن جریر حضرت سعدؓ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ جب حضورؐ پر وحی اتری تو آپؐ نے ان چاروں کو کپڑے تلے لے کر فرمایا: "کہ یارب! یہ میرے اہل ہیں اور میرے اہل بیت ہیں۔"

تفسیر ابنِ کثیر میں اسی آیت کی تفسیر کے سلسلے میں جہاں مذکورہ بالا روایات نقل کی گئی ہیں وہاں حضرت ابوسعید سے ان کا اپنا قول مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: میرے اور ان چاروں (حضرت علی، حضرت فاطمہؓ حضرات حسنین علیہم السلام) کے بارے میں یہ آیت اتری ہے۔

تفسیر حسینی میں بحوالہ عین المعانی مرقوم ہے کہ :-

"صاحب عین المعانی فرمودہ کہ ظاہر تفسیر دلالت بر آں دارد کہ اہل بیت ازواج باشند۔ امّا از عائشہؓ و ام سلمہؓ و ابوسعید خدریؓ و انس بن مالکؓ نقل کردہ اند کہ اہلِ بیت فاطمہ و علی و حسن و حسین اند، و در اسباب نزول آوردہ کہ ام سلمہؓ فرمود کہ پیغمبر در خانۂ من بر گلیمے کہ بر فراش وی افگندہ بودیم نشستہ بود، فاطمہ در آمدہ و جہتِ حضرتؐ سنبوسات با گوشت پختہ آوردہ بود۔ حضرت فرمود کہ ایفاطمہ! علی و فرزندان ترا بخوان تا دریں خوان باما ہمکاسہ شوند۔ چوں طعام خوردہ مصطفیٰؐ فضلۂ آں گلیم بر ایشاں پوشید و گفت خدایا! اینہا اہلِ بیتِ من اند۔ رجس را از ایشاں ببر و ایشاں را پاکیزہ گردان۔ ایں آیت نازل شد و من سر خود

در زیرِ گلیم کردم وگفتم یا رسول اللہ! من نہ از اہلِ بیتِ توام؟ فرمود کہ اِنَّکَ عَلٰی خَیْرٍ۔ ازیں جہت است کہ آلِ عبا بریں پنج تن اطلاق می کنند۔ ؎

آلُ الْعَبَاءِ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَابْنَتُہٗ
وَالْمُرْتَضٰی ثُمَّ سِبْطَاہُ اِذَا جَمَعُوْا

در تفسیر و بعضی دیگر در تفاسیر از انس بن مالکؓ نقل می کنند کہ چوں وقتِ نماز بر درِ خانۂ فاطمہؓ بگذشتے، گفتے الصَّلٰوۃُ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا۔

حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد ایک دفعہ حضرت حسن علیہ السلام نے منبر پر خطبے میں کہا کہ اے عراقیو! ہم اہلِ بیت ہیں۔ جن کے بارے میں آیت اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ ...... الخ اُتری ہے۔

آیت مبارکہ کی تفسیر کے سلسلے میں محولا بالا تمام روایات سے واضح ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اہلِ بیت کا لفظ حضرت محمد صلعم، حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین علیہم السلام کے لئے ہی استعمال فرمایا ہے مسند احمد و ترمذی میں ہے کہ رسول مقبول صلعم صبح کی نماز کے لئے جب نکلتے تو حضرت فاطمہ کے دروازے پر پہنچ کر فرماتے کہ اے اہل بیت! نماز کا وقت آگیا ہے۔ پھر یہی آیت تطہیر تلاوت فرماتے۔ نیز صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقمؓ سے ایک سوال کے جواب میں روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا "قسم ہے خدا کی! بیوی تو یہ ہے کہ وہ اپنے خاوند کے پاس کچھ عرصہ

دراز سے ہو مگر پھر اگر طلاق دے دے تو اپنے میکے میں اور اپنی قوم میں چلی جاتی ہے۔ آپ کے اہل بیت آپ کے اصل اور عصبہ ہیں۔ جن پر آپ کے بعد صدقہ حرام ہے۔" شاہ عبد القادر محدث دہلوی بھی اپنی تفسیر موضح القرآن میں مشہور روایتوں سے انہی نفوس مقدسہ کا اہل بیت ہونا تسلیم کرتے ہیں۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں کہ " چونکہ اولاد اور داماد بھی بجائے خود اہل بیت (گھروالوں) میں شامل ہیں۔ بلکہ بعض حیثیات سے وہ اس لفظ کے زیادہ مستحق ہیں۔ جیسا کہ مسند احمد کی ایک روایت میں "احق" کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے آپ کا حضرت فاطمہ، علی، حسن اور حسین علیہم السلام کو ایک چادر میں لے کر "اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اَھْلُ بَیْتِیْ" وغیرہ فرمانا یا حضرت فاطمہ کے مکان کے قریب سے گزرتے ہوئے "الصّلوٰۃ اھل البیت یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ .... الخ" سے خطاب فرمانا اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے تھا کہ گو آیت کا نزول بظاہر ازواج کے حق میں ہوا اور ان ہی سے مخاطب ہو رہا ہے۔ مگر یہ حضرات بھی بطریق اولیٰ اس لقب کے مستحق اور فضیلت تطہیر کے اہل ہیں۔

مولانا اشرف علی شاہ صاحب تھانوی اپنی مشہور و معروف تفسیر بیان القرآن میں فرماتے ہیں۔ "اس مقام پر جو لفظ اہل بیت آیت تطہیر میں آیا ہے، سیاق و سباق کے دیکھنے سے بالیقین اس کا مصداق ازواج مطہرات ہیں۔ اب رہا [illegible] کا اس کا مصداق ہونا، جیسا کہ حدیث میں ہے۔ کہ

آپ نے ان حضرات کو کملی میں لپیٹ کر فرمایا کہ "اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اَھْلُ بَیْتِیْ .... الخ" یا ازواج مطہرات کا مصداق نہ ہونا جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت ام سلمہؓ نے بھی کملی میں آنا چاہا تو آپ نے فرمایا "اِنَّکِ عَلٰی خَیْرٍ" اور ان کو داخل نہیں کیا۔ سو اس میں تحقیق بات یہ ہے، کہ آیت اور حدیث میں اہلِ بیت کا مفہوم متحد نہیں بلکہ حدیث میں تو عترت مراد ہے۔ اور آیت میں عام مراد ہے۔ ایک نوع تو آیت ہی کی مدلول ہے اور دوسری نوع کا مدلول ہونا آپ نے اپنے فعل سے ظاہر فرما دیا۔ حضرت زید بن ارقمؓ کا ارشاد ہے کہ "اہل بیت وہ ہیں جن پر صدقہ حرام ہے یعنی عترت" جب ان سے اہل بیت کے معنی پوچھے گئے۔ پس قرینہ سوال سے انہوں نے یہ معنی فرمائے۔ باقی رہا۔ نہ ان سے آیت کی تفسیر پوچھی گئی اور نہ انہوں نے آیت کے متعلق یہ ارشاد فرمایا۔"

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی، حضرت شبیر احمد عثمانی اور حضرت سید اشرف علی صاحب تھانوی سب اس امر کے تو مقر ہیں کہ احادیث صحیحہ سے تو یہی ثابت ہے کہ اہل بیت حضرت محمد صلعم، حضرت فاطمہ، حضرت علی، حضرت حسن، اور حضرت حسین علیہم السلام ہی ہیں۔ لیکن قرآن کریم کے سیاق سباق سے اسی آیت کا حضرت محمد صلعم کے ساتھ ازواج مطہرات کی شان میں ہونا قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیئے اب ہم اس مسئلے کا تجزیہ کریں۔

دراصل حق تو یہی ہے کہ رسول مقبول صلعم ہی قرآن کریم کے واحد مفسر

ہیں اور دوسرا کوئی شخص اس کی تفسیر کا حق بلا واسطہ نہیں رکھتا۔ آنحضورؐ ہی یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ یعنی قرآن کریم کے مطالب سمجھانے والے اور دانائی سکھانے والے ہیں۔ جہاں تو آن کریم پر عامل ہونے میں ہم آنحضور صلعم کے محتاج ہیں، اس کی آیات کے معانی و مطالب تک رسائی حاصل کرنے میں بھی آپ ہی کا دامن تھامنے پر مجبور ہیں۔ ادب میں الفاظ کے ظاہری (لغوی) معنی ہی نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ معنوی (اصطلاحی) معانی و مطالب بھی ہوتے ہیں۔ بعض اوقات معنوی معانی ہی مراد ہوتے ہیں۔ اور اس جگہ ظاہری (لغوی) معنی مراد لینا جائز نہیں۔ مثال کے طور پر لفظِ نبی کو ہی لیجئے۔ نبی کے لغوی معنی نئی نئی باتیں یا خبریں بتلانے والے یا پہنچانے والے کے ہیں لیکن اہل دانش و بینش خوب جانتے ہیں کہ نبی سے مراد وہ شخص ہے جسے اللہ تبارک و تعالیٰ منصب نبوت پر سرفراز فرما کر بنی نوعِ انسان کے لئے بشیر و نذیر قرار دے۔ اس پر ایمان لانا لابدی اور اس کا انکار کفر ہے۔ اس پر ایمان لائے بغیر تمام اچھے اعمال بھی اکارت جاتے ہیں۔ اور اعمالِ صالحہ قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ اسی طرح رسول کا لفظ ہے۔ جس کے ظاہری (لغوی) معنی فرستادہ شخص یا ایلچی کے ہیں لیکن اصطلاحی معنی صاحبِ شریعت نبی کے قرار دیئے گئے لہٰذا اللہ کی کتاب میں جہاں کہیں نبی یا رسول کا لفظ انسان کے لئے آئے گا ہم اس سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے منتخب شدہ، برگزیدہ، بشیر و نذیر اور مطاعِ شخصیت ہی مراد لیں گے۔ نئی نئی خبریں دینے والا یا ایلچی ہرگز نہیں سمجھیں گے۔ اگر عرب قرآنی آیت کے مطالب و معانی سمجھنے میں آنحضور صلعم

کی راہبری کے محتاج نہ ہوتے اور خود ہی انہیں سمجھنے پر قادر ہوتے، تو اللہ تعالےٰ قرآن کریم کو کسی نمایاں جگہ یا پہاڑ پر نازل فرما دیتا، اور قریش جب کتاب الٰہی کو جو عربی زبان میں لکھی ہوئی ہوتی۔ اس طرح آسمان سے نازل ہوتے ہوئے دیکھتے تو یقیناً بلا تامل ایمان لے آتے۔ لیکن اس صورت میں سب سے بڑا جھگڑا جو پیش آمادہ تفسیر کا ہی ہوتا۔ ہر آیت قرآنی پر عربوں کے خوب جھگڑے ہوتے اور اس بات کا امکان بھی موجود رہتا کہ کوئی شخص بھی صحیح معانی کی نشان دہی نہ کر سکتا۔ اور ان کی یہ جستجو اندھوں کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارنے سے قطعاً مختلف نہ ہوتی۔ لہٰذا اس صورت میں قرآن کریم لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت قرار نہ پا سکتا۔ واقعہ اور حقیقت یوں ہے کہ قرآنِ کریم آنحضور صلعم پر تھوڑا تھوڑا بقدرِ مصلحتِ خداوندی نازل ہوتا رہا۔ آپ اپنے قول و فعل سے اس کی تشریح و تفسیر فرماتے رہے تاکہ کلامِ الٰہی بنی نوع انسان پر قطعی حجت قرار پائے اور لوگ بروزِ قیامت یہ عذر نہ کر سکیں کہ ہمیں بعض امور کے مطالب و معانی معلوم نہ ہو سکے۔ لہٰذا وہ اپنے اعمال میں مجبور اور حق بجانب تھے۔ حضرت ام سلمہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت سعدؓ، حضرت ابو سعیدؓ اور حضرت زید بن ارقمؓ کی روایات اس حقیقت پر شاہد عادل ہیں کہ ازواج مطہرات میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلّم کا عملی طور پر اہل بیت کی نشان دہی کرنا اور حضرت سعدؓ اور ابو سعیدؓ سے بیان کرنا بدیں وجہ تھا کہ لوگ اس آیت کا مصداق قرینے سے قرار دے کر غلطی نہ کریں۔ بلا شبہ ازواجِ مطہرات دنیا و آخرت میں حضور صلعم کی بیویاں اور جمیع مومنین کی مائیں

ہیں جن میں حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین علیہم السلام بھی شامل ہیں۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم ایسی کوئی معتبر حدیث ازواج مطہرات کے حق میں نہیں پاتے جس سے اس آیت کا مصداق انہیں قرار دیا جا سکے۔

اب جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت تطہیر کی قولی تفسیر اور عملی تشریح یہ فرمائی ہے کہ آپ کے اہلِ بیت حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین علیہم السلام ہی ہیں تو پھر قرینے، سیاق و سباق وغیرہ کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔ ہر آیت کے سلسلے میں رسول مقبولؐ کی تفسیر اور تشریح ہم پر آخری حجت ہے۔ قرآن کریم کی ایک اور آیت (آیت مباہلہ) سے بھی یہی حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اہلِ بیت اطہار میں ازواج النبی، امہات المومنین اور دین میں انتہائی بلند مقام رکھنے کے باوجود اہلِ بیت میں شامل نہیں ہیں۔

اللہ تبارک و تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:-

"فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ
پھر جو شخص حجت کرے آپ سے اس میں بعد اسکے کہ آچکا آپکے پاس علم
فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا
تو کہہ دیجئے آؤ ہم بلالیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو
وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ
اور تمہاری عورتوں کو اور اپنے نفسوں کو اور تمہارے نفسوں کو پھر ہم گڑگڑا کر دعا کریں
فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ٥ (سورہ آلِ عمران آیت ۶۱)
اور لعنت کریں اللہ کی جھوٹوں پر۔

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب اہل نجران کے وفد نے آنحضورؐ کے دلائل ساطع و براہین قاطع کے باوجود حضرت عیسےٰ علیہ السّلام کے ابن اللہ قرار دیئے جانے کے باطل عقیدے سے پہلوتہی نہ کی۔ لہٰذا حکم ہوا کہ فریقین اپنے ساتھیوں، عورتوں اور بچوں سمیت میدان مباہلہ میں آکر جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں۔ اس آیت میں بظاہر ہر دو فریق کے بیٹوں، ان کی عورتوں اور ان کے اپنوں کو بلایا گیا ہے۔ لیکن حالت یہ ہے کہ اس وقت بظاہر لغوی معنوں میں آپ کی اولاد نرینہ زندہ موجود نہیں ہے۔ نیز آنحضورؐ کے بیٹے ہونے کے دعوے داروں کے قول کا ابطال اللہ تعالےٰ نے "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ" یعنی محمد صلعم تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، فرما کر کر دیا۔ آیئے اب تحقیق کریں کہ آنحضور صلعم کے بیٹے کون تھے۔ جن کے لئے اللہ تعالےٰ نے حضور مقبول صلعم سے "اَبْنَآءَنَا" کہلایا۔ اس سلسلے میں ہمیں آنحضورؐ کے ارشاد کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ مشہور و معروف مؤرخ عمر ابو النصر نے اپنی تصنیف "الزہراءؓ" میں بحوالہ مسند احمد بن حنبلؒ آنحضرت صلعم کا قول نقل فرمایا ہے کہ۔

"اللہ نے ہر نبی کی اولاد اس کے اپنے صلب سے بنائی۔ لیکن میری اولاد علیؑ کے صلب سے بنائی۔"

نیز لکھا ہے کہ رسول اللہ حضرت فاطمہ کی اولاد کے سوا اور بیٹیوں کی اولاد کو اپنی نسل سے خیال نہ کرتے تھے، صرف حضرت فاطمہؓ کی اولاد کو ہی یہ شرف حاصل تھا۔

اسی کتاب میں حضرت عمر ابو النصر رقمطراز ہیں کہ ترمذی نے مناقب حسنؓ و

حسینؓ میں، اور بغوی نے اپنی کتاب "مصابیح السنہ" کے باب مناقب اہل البیت صلوات اللہ علیہم میں حضرت اسامہؓ بن زیدؓ کی زبانی یہ روایت بیان کی ہے:۔

"میں نے کسی ضرورت سے رسول اللہ صلعم کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا آپ کوئی چیز چادر میں لپیٹے ہوئے باہر تشریف لائے۔ جب میں اپنی ضرورت بیان کر چکا تو آپ سے دریافت کیا۔ یا رسول اللہ! یہ آپ کیا لپیٹے ہوئے ہیں؟ آپ نے کپڑا اٹھایا تو اس میں سے حسنؓ و حسینؓ ظاہر ہوئے جو آپ کی گود میں چڑھے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا" یہ دونوں میرے بیٹے اور میری بیٹی کے لختِ جگر ہیں۔ اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں، تو بھی ان دونوں سے اور ہر اس شخص سے جو ان سے محبت کرتا ہے، محبت فرما"۔

حضرت انسؓ بن مالک بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلعم نے حضرت فاطمہ سے فرمایا: "میرے بیٹوں کو میرے سامنے لاؤ" جب دونوں آپ کے پاس آئے تو آپ نے انہیں سینے سے چمٹا لیا۔

ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفا میں حضرت ولی اللہ شاہ صاحب نے محمد بن اسامہ بن زید کی ایک روایت جو انہوں نے اپنے باپ کے حوالے سے نقل فرمائی ہے۔ جس کی رو سے رسول اللہ صلعم نے فرمایا "اے علی تم میرے داماد اور میرے بیٹے کے باپ ہو۔ تم مجھ سے ہو اور میں تجھ سے ہوں"۔

پس ان روایات سے ثابت ہوا کہ حضرات حسن و حسین علیہم السلام آنحضرت صلعم کے بیٹے اور "اَبنَاءَنَا" کے مصداق تھے۔ لہٰذا رسول مقبول صلعم آپ کی

ہی اللہ تعالےٰ کے حکم کے تحت میدانِ مباہلہ میں ہمراہ لے گئے۔ "نسآ ئَ نا" کے تحت آنحضور صلعم اُمہات المومنین کو چھوڑ کر صرف حضرت فاطمہ علیہا السّلام کو ہی ساتھ لے گئے۔ حالانکہ نسآ ئَ نا کا اطلاق بیوی، بہن، بیٹی یعنی از قسم عورت کے سب پر ہو سکتا ہے۔ "اَنفُسَنَا" میں آنحضرت صلعم تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو چھوڑ کر صرف حضرت علی علیہ السّلام کو ہی لے گئے۔ درحقیقت ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔ دعوتِ ذوالعشیرہ میں حضرت علی ہی آنحضور صلعم کے ناصر و وزیر بنے تھے۔ مواخاتِ مکہ و مدینہ میں دونوں جگہ آپ ہی رسولِ مقبول صلعم کے بھائی ہوئے۔ ہوئے بھی بھائی بنے۔ آپ ہی رسول مقبول صلعم کے نزدیک ایسے تھے جیسے حضرت موسٰی علیہ السّلام کے نزدیک حضرت ہارون علیہ السّلام۔ یہی وجہ تھی کہ نفسِ رسول قرار دیئے جا کر میدانِ مباہلہ میں آنحضور صلعم کے ہمراہ تشریف لے گئے۔ سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اس آیت کی عملی تفسیر کر کے یہ ظاہر فرما دیا کہ یہی پنج تن صادقین اور مصداقِ اہل بیت ہیں۔ ان چاروں نفوس کو میدانِ مباہلہ میں لیجا کر آنحضور صلعم نے اپنا تمام اثاثہ مباہلے کے لئے پیش کر دیا تھا۔ شاہ عبد القادر رح محدث دہلوی اپنی تصنیف موضح القرآن میں اسی آیت کی تفسیر کے تحت تحریر فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تب آنحضرت صلعم نے نصاریٰ کے عالموں کو بلا کر فرمایا کہ قضیہ میں تمہیں سمجھاتا ہوں اور دلیلیں مضبوط بتاتا ہوں تم زیادہ جھگڑتے اور دشمن ہوتے ہو۔ اب آؤ کہ ہم تم اس طرح قسم کھائیں اور جھوٹوں پہ لعنت کریں۔ اور سچا اور جھوٹا سب معلوم ہو۔ نصاریٰ کے عالموں نے یہ بات قبول کی اور راضی ہوئے دن اور جگہ مقرر کیا اور دوسرے دن حضرت محمد صلعم نے حضرت امام حسین ؑ کو گود

میں لیا اور حضرت حسنؑ کا ہاتھ پکڑا اور حضرت فاطمہ علیہا السلام کو اپنے پیچھے اور حضرت علی المرتضیٰ کو ان کے پیچھے لے کر چلے۔ اور فرمایا کہ جب میں دعا مانگوں تو تم آمین کہنا۔ انہوں نے قبول کیا اور ادھر جو نصاریٰ کے بڑے بڑے عالم تھے اور ان کو دیکھا اور پکارا اپنی قوم کو کہ اے یارو! ان کے مقابلے سے ڈرو کہ جو ہم یہ چند صورتیں دیکھتے ہیں، اگر دعا کریں تو پہاڑ زمین سے اکھڑ جائیں۔ اگر تم مقابلہ کروگے تو ایک نصرانی بھی زمین پر نہ رہے گا۔ چنانچہ دو ہزار دینار اور تیس زرہیں سالانہ دینے کا وعدہ کیا اور نجران کو واپس لوٹ گئے۔

تفسیر ابن کثیر میں حضرت جابرؓ سے روایت نقل کی گئی ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ "ندع ابناءنا ......" الخ والی آیت انہی (اہل بیت) کے بارے میں نازل ہوئی۔ "انفسنا" سے مراد خود رسول صلعم اور حضرت علی علیہ السلام، "ابناءنا" سے مراد حضرت حسنین علیہم السلام، "نساءنا" سے مراد حضرت فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا ہیں علاوہ ازیں یہ بھی تحریر ہے کہ مستدرک حاکم وغیرہ میں بھی اسی معنی کی حدیث مروی ہے۔

مسلم شریف میں سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ الٰہی یہ میرے اہل بیت ہیں یعنی علی، فاطمہ، حسن اور حسین علیہم السلام حضرت مولانا خرم علی مشارق الانوار کے ترجمے میں اس حدیث کے بیان کا موقع متعین فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ یہ آیت مباہلہ کے نزول کا دن تھا جب یہ آیت اتری تو صبح کو آنحضرت صلعم نکلے، امام حسن کا ہاتھ پکڑے، امام حسین کو گود میں لئے، حضرت فاطمہ حضرت کے پیچھے اور علی المرتضیٰ سب کے پیچھے۔ پھر

یہ حدیث ارشاد فرمائی۔

حقیقت یہی ہے کہ رسول مقبول صلعم کے ساتھ حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین علیہم السلام ہی وہ نفوسِ مطہرہ ہیں جن کے لئے اللہ تبارک و تعالےٰ نے آیتِ تطہیر میں لفظِ اہلِ بیت ارشاد فرمایا ہے۔

بعض علماء نے آیتِ کریمہ قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ (پارہ ۲۵۔ الشوریٰ) سے اہلِ بیتِ نبی کی محبت مراد لے کر یوں معنی کئے ہیں کہ میں تم سے تبلیغ پر کوئی بدلہ نہیں مانگتا۔ میں اتنا چاہتا ہوں کہ میرے اقارب سے محبت کرو۔ چنانچہ ابو دیلم کا بیان ہے کہ جب حضرت علی بن حسین علیہ السلام کو قید کر کے لایا گیا اور دمشق کے بالاخانے میں رکھا گیا تو ایک شامی نے شکر ادا کیا۔ آپ نے اسی آیت کی تلاوت کے متعلق پوچھا۔ اس نے کہا کہ پھر کیا تم وہ ہو؟ آپ نے فرمایا "ہاں"۔ حضرت عمرو بن شعیب سے جب اس آیت کی تفسیر پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا اس سے مراد قرابتِ رسول ہے۔

ترمذی نے جابر بن عبد اللہ (ترمذی) سے روایت نقل کی ہے، کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ۔ كِتَابَ اللهِ وَعِتْرَتِي أَهْلَ بَيْتِي یعنی میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑتا ہوں، ایک اللہ کی کتاب اور دوسری اپنی عترت یعنی اہلِ بیت۔ اگر تم ان سے متمسک رہوگے تو میرے بعد گمراہ نہ ہوگے۔ اور یہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ میرے پاس حوضِ کوثر پر پہنچیں۔

بخاری و مسلم میں زید بن ارقم سے روایت ہے کہ حضرت صلعم نے فرمایا۔

"حمد و صلوٰۃ کے بعد اس بات کا دریافت کرنا ضروری ہے کہ خبردار ہو جاؤ اے لوگو! میں آدمی ہوں، عنقریب ہے کہ میرے پاس میرے رب کا پیغام لانے والا آوے تو میں اس کا کہنا مانوں - یعنی ملک الموت آوے اور میرا انتقال ہو - میں تم میں دو بڑی بھاری عمدہ چیزیں چھوڑے جاتا ہوں - ان دو میں اوّل تو خدا کی کتاب ہے - جس میں نور و ہدایت ہے - سو خدا کی کتاب کو لو اور خوب سا اسکو چمٹ جاؤ - یعنی اس پر عمل کرو - دوسری بزرگ چیز میرے اہل بیت ہیں - میں تم کو خدا یاد دلاتا ہوں اپنے اہل بیت کے معاملے میں، میں تم کو خدا یاد دلاتا ہوں اپنے اہل بیت کے معاملے میں، میں تم کو خدا یاد دلاتا ہوں اپنے اہل بیت کے معاملے میں" ایک دوسری روایت میں یوں ہے کہ خدا کی کتاب میں ہدایت اور نور ہے جس نے اس کو چمٹ لیا اور جس نے اس کو لیا وہ ہدایت پر ہوا، اور جس نے اس کو چھوڑا وہ گمراہ ہوا - ایک اور روایت میں یوں لکھا ہے کہ قرآن خدا کی رسی ہے - یعنی اس کے ملنے کا وسیلہ ہے - جس نے اس کی پیروی کی وہ راہ پر ہوا اور جس نے اس کو چھوڑ دیا وہ گمراہ ہوا - آنحضرت صلعم نے حدیثِ ثقلین حجۃ الوداع سے واپسی پر غدیر خم کے خطبے میں فرمائی تھی - جس کے ساتھ ہی حضرت علی علیہ السّلام کو شرفِ ولایت بخشا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے آپ کو اس بزرگی کے عطا ہونے پر مبارک باد پیش کی [1]

طبرانی اور بیہقی نے حضرت ام سلمہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ

---

[1] سیرت النبی حصہ دوم صفحہ ۱۶۸

صلعم نے فرمایا:- میری مسجد میں داخل ہونا ہر زنِ حائضہ اور مردِ جنب پر حرام ہے سوائے میرے اور میرے اہلِ بیت علی و فاطمہ و حسن و حسین کے۔"

مسند خوارزمی میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول مقبول صلعم سے سنا کہ آپ نے فرمایا:- "مَثَلُ اَهْلِبَيْتِي كَمَثَلِ سَفِيْنَةِ نُوْحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجٰى وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ" (میرے اہل بیت کی مثال مثل نوح کی کشتی کے ہے۔ جو اس میں سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جو ہٹا رہ گیا، وہ غرق ہوا) ؎۱۔ یہی روایت حبیش بن المغفرہ سے طبرانی نے کبیر اوسط میں اور ابو یعلی نے اپنی مسند میں بھی نقل کی ہے۔ مسند احمد میں حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی صلعم کو یہ فرماتے سنا ہے، کہ "آگاہ ہو! میرے اہل بیت تمہارے درمیان نوح کی کشتی کی مانند ہیں۔ جو شخص کشتی میں سوار ہوا، اس نے نجات پائی اور جو رہ گیا ہلاک ہوا۔" نیز دیلمی، حاکم، بزاز اور ابوالحسن مغازلی نے ابنِ عباسؓ سے نقل کیا، کہ رسول صلعم نے فرمایا:- میرے اہلِ بیت کی مثال ایسی ہے جیسے بنی اسرائیل میں بابِ حطّہ کی۔ جو اس میں داخل ہوا اُس کی مغفرت ہو گئی۔"

تمام احادیثِ مذکورہ سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ آنحضرت صلعم نے لفظِ اہلِ بیت کا مصداق حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین علیہم السلام کو ہی قرار دیا ہے۔ لہٰذا یہی مقدس نفوس اہل بیت

؎۱ ارشاد المقلوب بحوالہ مسند خوارزمی۔

ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ آنحضور صلعم کی اہلبیت اطہار سے محبت ان کی قریبی رشتہ داری کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ ان کے بارگاہِ الٰہی میں بزرگ و ممتاز ہونے کی بنا پر تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ حقیقی چچا زاد بھائی ہونے کے شرف میں حضرت جعفر طیارؓ حضرت علیؑ کے برابر تھے۔ تاہم مواخاتِ مدینہ میں آپ نے حضرت جعفر طیارؓ کا بھائی ایک انصاری کو بنایا اور حضرت علیؑ کے آپ بہ نفسِ نفیس خود بھائی بنے۔ داماد ہونے کا شرف حضرت عثمانؓ کو بھی حاصل تھا لیکن انہیں کبھی "اپنا" قرار نہ دیا گیا۔ یہاں تک کہ میدانِ مباہلہ میں انہیں نہ تو اَنْفُسَنَا میں ہمراہ لے گئے اور نہ ہی اَبْنَاءَنَا میں۔ اسی طرح جہاں تک بنتِ رسول ہونے کی حرمت کا تعلق ہے وہ حضرت زینبؓ، حضرت ام کلثومؓ اور حضرت رقیہؓ کو بھی حاصل تھی۔ لیکن احادیث سے صاف ظاہر ہے کہ آنحضور صلعم کو جو تعلق خاطر حضرت فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا سے تھا وہ کسی سے بھی نہ تھا۔ چنانچہ سیدۃ النساء العالمین کے اعلیٰ خطاب سے آپ ہی کو نوازا گیا۔ اگرچہ حضراتِ حسنین علیہم السلام آنحضور صلعم کی دخترِ نیک اختر کے بیٹے تھے، تو بقول بعض تمام امت بھی آپ کی روحانی اولاد تھی۔ سب جانتے ہیں کہ روحانی تعلق کو مادی تعلق پر فوقیت حاصل ہے۔ تاہم حضرات حسنینؑ کو آنحضور صلعم نے نوجوانانِ بہشت کے سردار قرار دیا۔ لہٰذا یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ رسولِ مقبول صلعم کی ان حضرات سے محبت زیادہ تر ان کی خدماتِ اسلام، نصرتِ دین اور قربتِ الٰہی کی وجہ سے تھی۔ آئیے اب ہم علیحدہ علیحدہ ان حضرات کی خصوصی خدمات کا جائزہ لیں۔ جن کی وجہ سے انہیں اللہ تعالیٰ کا اس قدر

قربت حاصل ہوا کہ آنحضورؐ نے انہیں اہل بیت قرار دیا۔

حضرت علی علیہ السلام سب سے پہلے اسلام لائے اور دعوتِ ذوالعشیرہ میں رسول اللہ صلعم کی نصرت کا اعلان کیا۔ چنانچہ آنحضور صلعم نے آپ کو بھائی اور وزیر قرار دیا۔ آپ نے آنحضور صلعم کی ہجرتِ مدینہ کے وقت رات کو ان کے بستر پر سو کر اور صبح کو کارِ امین سرانجام دے کر مواخاۃ میں اخی ہونے کا شرف حاصل کیا۔ آپ نے اسلام کی خدمت، اسلام کی حفاظت، غزواتِ بدر و احد میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر کی۔ چنانچہ ہاتف غیبی نے "لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار" کی ندا دے کر تحسین کی۔ آپ نے خندق، خیبر اور حنین کے میدانوں میں سرفروشی دکھائی۔ چنانچہ آنحضور صلعم نے تبوک کی طرف روانگی کے موقع پر آپ کو اپنے لئے "بمنزلہ ہارون من موسیٰ" قرار دیا۔ آپ نے میدانِ مباہلہ میں آنحضور کا ساتھ دیا۔ چنانچہ آنحضور صلعم نے حجۃ الوداع سے مراجعت کرتے وقت غدیر خم کے موقع پر "مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ" فرما کر مومنین کی آقائیت کا شرف بخشا۔

حضرت علی علیہ السلام کی اسلامی خدمات پر اللہ تبارک و تعالےٰ کی طرف سے جو انعامات ملے وہ مندرجہ ذیل تھے:۔

آپ سب سے پہلے اسلام لائے، رسول خدا صلعم کی نصرت کا بانگ دہل اعلان کیا اور بوقتِ ہجرتِ رسول صلعم آپ کے بستر پر سوئے۔ اللہ تعالےٰ نے بروایت حضرت ابو سعید خدری آپ کی شان میں آیت کریمہ "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَہُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ ط وَاللّٰہُ

رَءُوفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ (سورۃ البقرہ آیت ۲۰۷) (یعنی لوگوں میں بعض وہ ہے جو بیچ دیتا ہے اپنے آپ کو اللہ کی رضا جوئی میں اور اللہ بڑا مہربان ہے بندوں پر) نازل ہوئی۔

آپ نے غزوات میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ واقدی ناقل ہیں کہ اللہ تبارک و تعالٰی نے آپ کی خدمات کا اعتراف کیا۔ اور فرمایا۔

"اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۝ ۲۰

(کیا تم نے ٹھیرا یا پانی پلانے کو حاجیوں کے اور آباد رکھنے کو مسجد الحرام کے ویسا ہی جیسا کہ (عمل) اس شخص کا جو ایمان لایا اللہ اور یوم آخر پر اور جہاد کیا راہ میں اللہ کی۔ وہ باہم برابر نہیں ہو سکتے اللہ کے نزدیک، اور اللہ انہیں راہِ راست پر لاتا ظالم لوگوں کو۔ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا راہ میں اللہ کی اپنے مالوں اور جانوں سے، وہ سب سے بڑھ کر ہیں درجہ میں اللہ کے نزدیک اور وہی لوگ ہیں کامیاب)

لکھا ہے کہ ایک روز حضرت علیؑ، حضرت عباس اور حضرت طلحہ میں فخریہ گفتگو شروع ہوئی۔ طلحہ بولے "میں صاحب البیت ہوں"۔ عباس نے کہا۔ "میں ساقی ہوں، سقایت میرے سپرد ہے اور میں اس پر قائم و قابض ہوں"۔

حضرت علیؓ نے فرمایا "میں نہیں جانتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں نے سب لوگوں سے چھ ماہ پہلے حضرت صلعم کے ساتھ نمازِ خدا ادا کی اور میں نے راہِ خدا میں جہاد کیا"۔ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت شبیر احمد عثمانی نے بھی فوائد موضح الفرقان میں اسی آیتِ کریمہ کے شانِ نزول میں حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کی بحث کا بیان فرمایا ہے۔

آپ نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں استطاعت سے زیادہ خرچ کیا۔ چنانچہ تفسیر موضح القرآن میں شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ رقمطراز ہیں کہ ایک دن حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی المرتضٰے کے گھر میں آئے، دیکھا حضرات حسنین رضی اللہ عنہما بیمار تھے۔ حضرت محمد صلعم نے ان کے ماں باپ سے فرمایا کہ تم منت مانو کہ خدائے تعالےٰ تمہارے فرزندوں کو صحت بخشے۔ انہوں نے منت مانی کہ ہم تین روزے نذر خدائے تعالےٰ رکھیں گے۔ اللہ تعالےٰ نے حضرات حسنینؑ کو صحت دی۔ حضرت کے ہاں روٹی پکی۔ روزہ کھولنا چاہا، کہ اتنے میں ایک فقیر نے پکارا کہ اے اہلِ بیت پیغمبر کے، میں محتاج مسلمان ہوں۔ مجھے کھانے کو دو، خدائے تعالےٰ اس کا بدلہ بہشت میں دے گا۔ حضرت مرتضٰے علیؑ نے اپنا حصہ سب اسے دے دیا۔ حضرت فاطمہؑ نے بھی اپنا حصہ اسے دے دیا آپ دونوں نے کچھ نہ کھایا اور فجر کو پھر روزہ رکھا۔ دوسرے دن شام کو ایک یتیم آیا کہ کچھ اللہ کے لیے دو، ان دونوں نے پھر اپنا کھانا اسے دے دیا۔ تیسرے دن پھر روزہ رکھا، تیسری شام ایک بندھوا چھوٹ آیا۔ آپ (دونوں) نے پھر کھانا اسے دے دیا۔ اور بغیر کچھ کھائے سو رہے۔ سو اللہ تعالےٰ نے انکی

شان میں آیات کریمہ
"یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا ــــ الخ (آیات ۷
لغایت ۲۲ - سورہ دھر پارہ ۲۹) نازل فرمائیں۔
آپ نے اپنی جان کو اللہ کے لیے وقف کیا ہوا تھا۔ اور رسول مقبول صلعم
کی متابعت اپنے نفس پر فرض کر رکھی تھی۔ حتی الوسع خیرات فرمایا کرتے تھے
لہٰذا اللہ تعالےٰ نے بھی آپ کو مومنین کے آقا ہونے کا شرف بخشا۔ چنانچہ
حضرت سید عبدالقادر محدث دہلویؒ اپنی معرکتہ الآرا تفسیر موضح القرآن میں
آیت کریمہ اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ
یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ"
(پارہ ۶ - المائدہ آیت ۵۵) (بے شک تمہارا ولی (آقا) تو اللہ
اور اس کا رسول اور وہ مومن ہی ہیں جو قائم رکھتے ہیں نماز اور ادا کرتے ہیں زکوٰۃ
اور وہ جھکے ہوئے (رکوع میں) ہوتے ہیں) کا نزول حضرت علیؑ کی شان میں قرار
دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلعم ایک بار حجرۂ مبارک سے مسجد میں آئے۔
بعضوں کو دیکھا کہ رکوع میں ہیں۔ بعضوں کو سجدے میں دیکھا اور بعضوں کو کھڑے
دیکھا۔ آپ نے ایک سائل کو دیکھا اور فرمایا کہ کسی نے کچھ دیا تجھ کو۔ سائل نے
انگوٹھی سونے یا روپے کی آنحضرتؐ کو دکھائی اور اشارہ کیا حضرت مرتضیٰ علیؑ
کی طرف کہ اس رکوع کرنے والے نے رکوع میں دی ہے۔ حضرت شیخ سعدی
شیرازیؒ بھی اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:۔
"سبب نزولش این بود کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلّم

مسجد در آمدند- اصحاب را دیدند کہ بنماز مشغول اند- قومی در قیام و برخی در قعود و بعضے در رکوع و جمعے بسجود- سائل بر در مسجد استادہ بود- آنحضرت ازو پرسید کہ کسے بتو انگشتری داد- انگشتری از زر نمود و اشارہ بمرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ کرد و گفت "ایں رامن داد" فرمود "در چہ حال" گفت "در حالتِ رکوع"- آنحضرت تکبیر بر زبانِ مبارک فرمودہ ایں آیت را فرمود و روتیکہ ایں انگشتری باد داد خداوند تعالےٰ آیت فرد فرستاد کہ اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہ- الخ)

جہاں تک حضرت فاطمہ صلواۃ اللہ علیہا کی اسلامی خدمات کا تعلق ہے۔ آپ کی والدۂ ماجدہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اپنی تمام دولت دینِ اسلام کے لئے وقف کردی تھی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بنوت تک آنحضور صلعم کی بہترین غمخوار اور غمگسار رہیں۔ چنانچہ آپ کے انتقالِ پُرملال کے سال کو آنحضرت صلعم نے عام الحُزن قرار دیا۔ حضرت فاطمہؑ ابھی صرف نو سال کی بچی تھیں۔ تم ہیں پورے تین سال یہ ننھی سی جان اپنی والدۂ محترمہ کی طرح سے آنحضور صلعم کی خدمت گذار رہیں۔ جب مشرکین عورتیں رسول مقبول صلعم کے سرِ مبارک پر کوڑا کرکٹ ڈال دیتیں اور آنحضورؐ سرہیں دھول لئے گھر تشریف لاتے تو حضرت فاطمہؑ روتی جاتی تھیں اور آنحضور صلعم کا سرِاقدس دھوتی جاتی تھیں۔ عقبہ بن ابی معیط نے جب بوقتِ سجدہ آپ کی پشتِ مبارک پر اونٹ کی اوجھڑی رکھ دی تو آپ ہی مدد کو پہنچیں۔ غزوۂ احد میں جب آنحضورؐ زخمی ہوگئے تو آپ فرطِ محبت سے مغلوب ہو کر میدانِ جنگ میں جا پہنچیں آنحضر

صلعم کے زخموں کو دھویا اور کھجور کی چٹائی جلا کر اس کی راکھ زخموں پر رکھی۔ تب جا کر کہیں خون بند ہوا۔ چنانچہ آنحضرت صلعم آپ کی انہی خدمات کے عوض آپ کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ آپ کی یہ غم خواری او و غمگساری ہی تھی کہ آنحضورؐ نے آپ کو سیّدۃ النساء العالمین کا خطاب عطا فرمایا۔ اللہ تبارک و تعالےٰ نے مباہلے کے لئے طلب فرمایا اور تمام اسلامی خدمات کے بدلے آیتِ تطہیر نازل کرکے آپ کو پاک و پاکیزہ فرمایا۔

حضرت حسن علیہ السلام سے آنحضور صلعم بہت محبّت کرتے تھے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ آپ کی زمانۂ آئندہ میں ظہور پذیر ہونے والی اسلامی خدمات تھیں۔ چنانچہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میرا یہ بیٹا مسلمانوں کے دو بڑے متحارب گروہوں میں صلح کرائے گا۔ اللہ تبارک و تعالےٰ بھی مسلمانوں کے متحارب گروہوں میں صلح کرانے کا حکم دیتا ہے۔ حضرت حسن علیہ السّلام نے اللہ تعالےٰ کے اس حکم پر عمل فرمایا۔ اور مسلمانوں کو خونریزی سے بچایا۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے آیتِ مباہلہ اور آیتِ تطہیر کے مصداق افراد میں آپ کو شامل کرکے برگزیدہ و پاکیزہ فرمایا۔

سیّدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حضرت حسین علیہ السّلام سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ آنحضور صلعم کی دُور بین نگاہیں اس میدانِ مباہلہ کے ننھے مجاہد کی راہِ حق میں ثابت قدمی دیکھ رہی تھیں۔ اللہ تعالےٰ نے آنحضرتؐ کو حق کی خاطر اور اسلامی اصولوں کے تحفظ کے لئے حضرت حسینؑ کے اپنی جان قربان کرنے کی اطلاع دے دی تھی۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ آنحضورؐ آپ

کے بچپن میں رونے سے آزردہ خاطر ہو جایا کرتے تھے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے آپ کو ہی پوچھتے۔ دوشِ مبارک پر سوار کئے پھرتے۔ اور جب کوئی کہتا کہ کیا اچھی سواری ہے! تو فرمایا کرتے کہ سوار بھی کتنا اچھا ہے![1] اللہ تبارک و تعالےٰ نے آپ کو زمانۂ آئندہ میں کربلا کے امتحان میں ہونے والی کامیابی کے سبب سے ہی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا فدیہ قرار دے کر "ذبح عظیم" فرمایا۔

ناظرین کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اہلِ بیت اطہار علیہم السلام نے اسلام کی کتنی خدمات سر انجام دی ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ آنحضور صلعم آپ سب سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ آنحضرتؐ کا یہ معمول تھا کہ روز صبح نماز کے لئے حضرت فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا کے دروازے پر باآوازِ بلند فرماتے "اے اہلبیتؑ! نماز کا وقت ہو گیا ہے" پھر آیتِ تطہیر تلاوت فرماتے۔ جب کبھی سفر پر تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں اسی گھر سے رخصت ہوتے اور جوں ہی واپس تشریف لاتے تو مسجد میں نمازِ شکرانہ ادا کرنے کے بعد سیدھے یہاں ہی آتے اور بعد ازاں ازواجِ مطہرات کے ہاں تشریف لے جاتے۔ جب کبھی حضرت فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا سے ملنے آتے تو آتے ہی فرماتے کہ میرے بچوں کو لانا۔ حضرت فاطمہؑ حضرات حسنین علیہما السلام کو لاتیں۔ آپ انکو سونگھتے اور سینے سے چمٹاتے۔ مسجدِ نبوی میں سوائے آنحضور صلعم اور اہلبیت

---

[1] ترمذی شریف

اظہار کے کسی عورت کو بحالتِ حیض اور کسی مرد کو بحالتِ جنب داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ جب آنحضرت صلعم اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف تشریف لے جانے لگے تو امتّت کو اہلبیت کی محبت کی وصیت فرمائی۔ انہیں "کشتیٔ نوح" کی مانند قرار دے کر ان سے متمسک رہنے کی تلقین کی۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ آپ کی ہمیشہ بین نگاہیں یہ دیکھ چکی تھیں کہ قریش اپنی منتقم المزاجی کے باعث عنقریب اپنے مقتول آبا واجداد کا بدلہ ان کے اہلبیت سے ضرور لے کر رہیں گے۔ درآنحالیکہ وہ سب مقبول بارگاہِ ایزدی ہیں۔ لہٰذا آپ نے قریش کو اس فعلِ شنیع سے بچانے کی حتی الامکان کوششیں کیں اور ان کی عزت کی بڑی وصیتیں فرمائیں لیکن افسوس کہ امتّت نے وہی کیا جس کا آنحضور صلعم کو اندیشہ تھا۔

مولانا شبلی نعمانی اپنی مشہور تصنیف "الفاروق" میں رقمطراز ہیں:۔

"حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی کے تعلقات قریش کے ساتھ کچھ ایسے پیچ در پیچ تھے کہ قریش کسی طرح ان کے آگے سر نہیں جھکا سکتے تھے۔ علامہ طبری نے اس معاملے کے متعلق حضرت عمرؓ کے خیالات مکالمے کی صورت میں نقل کئے ہیں۔ ہم ان کو اس موقع پر اس لئے درج کرتے ہیں کہ اس سے حضرت عمرؓ کے خیالات کا رازِ سربستہ معلوم ہوگا۔ مکالمہ عبداللہ بن عباسؓ سے ہوا جو حضرت علیؓ کے ہم قبیلہ اور طرفدار تھے۔

حضرت عمرؓ۔ "کیوں عبداللہ ابن عباس! علی ہمارے ساتھ کیوں نہیں شریک ہوتے؟"

عبداللہ بن عباسؓ: "میں نہیں جانتا۔"

حضرت عمرؓ: "تمہارے باپ رسول اللہؐ کے چچا اور تم رسول اللہؐ کے چچیرے بھائی ہو۔ پھر تمہاری قوم طرفدار کیوں نہ ہوئی؟"

عبداللہ بن عباسؓ: "میں نہیں جانتا۔"

حضرت عمرؓ: "لیکن میں جانتا ہوں۔ تمہاری قوم تمہارا سردار ہونا گوارا نہیں کرتی تھی۔"

عبداللہ بن عباسؓ: "کیوں؟"

حضرت عمرؓ: "وہ یہ نہیں پسند کرتے تھے کہ ایک ہی خاندان میں نبوت وخلافت دونوں آجائیں۔ شاید تم یہ کہو گے کہ حضرت ابوبکر نے تم کو خلافت سے محروم کردیا۔ لیکن خدا کی قسم یہ بات نہیں۔ ابوبکر نے وہ کیا جس سے زیادہ مناسب کوئی بات نہیں ہوسکتی تھی۔ اگر وہ تم کو خلافت دینا بھی چاہتے تو انکا ایسا کرنا تمہارے حق میں کچھ بھی مفید نہ ہوتا۔"

دوسرا مکالمہ اس سے زیادہ مفصّل ہے۔ کچھ باتیں تو وہی ہیں جو پہلے مکالمے میں گذریں۔ کچھ نئی ہیں اور وہ یہ ہیں۔

حضرت عمرؓ: "کیوں عبداللہ بن عباس! تمہاری نسبت میں بعض بعض باتیں سنا کرتا تھا۔ لیکن میں نے اس خیال سے اس کی تحقیق نہیں کی کہ تمہاری عزت میری آنکھوں میں کم نہ ہوجائے۔"

عبداللہ بن عباسؓ: "وہ کیا باتیں ہیں؟"

حضرت عمرؓ: "میں نے سنا ہے کہ تم کہتے ہو کہ لوگوں نے ہمارے خاندان سے خلافت حسداً اور ظلماً چھین لی"۔

عبداللہ بن عباسؓ: "ظلماً کی نسبت تو میں نہیں کہہ سکتا، کیونکہ یہ بات کسی پر مخفی نہیں۔ لیکن حسداً، تو اس کا تعجب کیا ہے؟ ابلیس نے آدمؑ پر حسد کیا اور ہم لوگ آدم ہی کی اولاد ہیں۔ پھر محسود ہوں تو کیا تعجب ہے"۔

حضرت عمرؓ: "افسوس! خاندان بنی ہاشم کے دلوں سے پرانے رنج اور کینے نہ جائیں گے"۔

عبداللہ بن عباسؓ: "ایسی بات نہ کہئے۔ رسول اللہ صلعم بھی ہاشمی ہی تھے"۔

حضرت عمرؓ: "اس تذکرے کو جانے دو"۔

عبداللہ بن عباسؓ: "بہت مناسب"۔

اس مکالمے سے صاف ظاہر ہے کہ قریش حضرت علیؓ کے بہت ہی خلاف تھے۔ قریش کے ہاتھوں ہی اہل بیت کو تمام مصائب برداشت کرنے پڑے۔ چنانچہ آنحضور صلعم کی رحلت کے بعد حضرت فاطمہ علیہا السلام نے بڑی تکالیف اٹھائیں یہاں تک کہ آپ کا جنازہ بھی رات کو اٹھا اور قریش کو شامل نہ کیا گیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے بے انتہا مصیبتیں جھیلیں۔ جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں قریش ہی مقابلے پر رہے اور اہل بیت کو تباہ کرنے میں کوئی کسر بھی نہ اٹھا رکھی۔ حضرت امام حسن علیہ السلام کو "مذل المومنین" جیسے مذموم خطاب سے نوازا گیا اور آخرکار زہر دلا دیا گیا۔ قریش نے اسے بھی ناکافی سمجھا اور جنازے تک پر تیر برسائے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کو معہ خاندان و احباب دشتِ کربلا میں ذبح کر ڈالا۔ خیام اہلبیت کو لوٹا اور جلایا گیا۔ آنحضور صلعم کی نواسیوں اور پسماندگان اہل بیت کو قید کر کے بے کجاوہ اونٹوں پر کوفہ اور وہاں سے دمشق تک لے جایا گیا۔ اس جلوس کی زینت حضرت حسینؑ اور دیگر شہداء کے بریدہ سروں کو نیزوں پر بلند کر کے بڑھائی گئی۔ غرضیکہ جو کچھ کیا گیا آنحضورؐ کی "حدیثِ ثقلین" اور "حجۃ الوداع کے خطبے" کی خلاف ورزی میں ہی کیا گیا۔ اور یہی وجہ ہو گی کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں عرض کریں گے :۔

" وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ
اور عرض کرینگے رسول اللہ اے میرے پروردگار! بلاشبہ میری قوم نے سمجھا تھا
مَهْجُوْرًا ۝"
(پارہ ۱۹ - سورہ الفرقان)
اس قرآن کو بکواس۔

چند خصوصی فضائل اہل بیت اطہار علیہم السلام

(۱)

حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ آنحضور صلعم نے فرمایا "میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں" (ترمذی شریف)

(۲)

حضرت عبداللہ بن سعدؓ بن زرارہ سے مروی ہے کہ آنحضور صلعم نے فرمایا کہ "خدا نے علی کے متعلق میرے پاس وحی میں تین باتیں نازل کی ہیں۔ کہ وہ مومنوں کے سردار، متقیوں کے امام اور نمازیوں کے افسر ہیں"

(ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفاء)

(۳)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بنی صلعم سے روایت کی ہے کہ نساء اہلِ جنت کی سردار مریمؑ پھر فاطمہؑ پھر خدیجہؓ پھر آسیہؓ زنِ فرعون ہیں۔

(رحمۃ للعالمین جلد دوم صفحہ ۱۲۴)

(۴)

حضرت اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا: یا الٰہی میں حسنؑ وحسینؑ کو چاہتا ہوں، سو تو بھی ان کو چاہ" اور دوسری روایت یوں ہے کہ "الٰہی میں متفکر ان دونوں پر رحم کرتا ہوں تو بھی ان پر رحم کر۔" (بخاری شریف)

(۵)

روایت ہے کہ رسول مقبول صلعم نے فرمایا کہ "یہ دونوں (حضرات حسنینؑ) نوجوانانِ بہشت کے سردار ہیں۔"

(رحمۃ اللعالمین جلد دوم صفحہ ۱۲۳ بحوالہ الاستیعاب)

اقبال عاشقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم

ہر کہ عشقِ مصطفےٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست (اقبال)

محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلّم خاتم النبیّین ہیں۔ چونکہ آپ کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا، لہٰذا آپ پر بذریعہ وحی نازل کی گئی کتاب "قرآنِ کریم" بھی تمام سابقہ کتب سماوی کی ناسخ اور قیامت تک کے لئے ناقابلِ منسوخ ہے۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کو جمیع بنی نوعِ انسان کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالےٰ ہے:۔

"وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (سورت السبا)

اور تجھ کو ہم نے بھیجا، سو سارے لوگوں کو واسطے خوشی اور ڈر سنانے کو۔ لیکن بہت لوگ نہیں سمجھتے۔

انسان اللہ تعالےٰ کا اس زمین میں خلیفہ ہے۔ اس کا مقصدِ حیات اللہ تعالےٰ کی رضا کا حصول ہے۔ اللہ تعالےٰ کے احکامات اس کے مبعوث کردہ

انبیاء کے ذریعے انسانوں تک پہنچتے رہے ہیں۔ ہر نبی کو انسانوں کے لئے نمونہ بنا کر بھیجا گیا ہے اور اس کی اطاعت ان انسانوں پر فرض کی گئی ہے۔ جنکی طرف وہ بھیجا گیا ہے۔ آنحضور صلعم تمام انسانوں کی طرف مبعوث ہوئے ہیں۔ لہذا آپ پر ایمان لانا اور آپ کی اطاعت کرنا ہر انسان پر لازم ہے۔ قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالےٰ ہے:۔

"وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ

(سورۃ النساء)

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس واسطے کہ اس کا حکم مانیں اللہ کے فرمان سے۔

"مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ج" (سورۃ النساء)

جس نے حکم مانا رسول کا اس نے حکم مانا اللہ کا۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝

(سورۃ الاحزاب)

اور جو کوئی حکم پر چلا اللہ کے اور اس کے رسول کے، بتحقیق وہ مراد کو پہنچا۔

رسول اللہ صلعم کی اطاعت کے واضح احکامات اس لئے صادر ہوئے ہیں کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں فرماتے جو کچھ فرماتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم میں صاف ارشاد ہے :-

"وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ"

اور رسول نہیں کہتا اپنے نفس سے کچھ مگر جو اس کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے۔

"وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ" (سورہ انفال)

اور نہیں پھینکی تو نے جو کہ پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی۔

اِن ارشادات سے صاف ظاہر ہے کہ رسول کا فعل و قول تمام انسانوں کے لئے قطعی حجت ہے۔ یہی وجہ ہے اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی کو سب سے افضل بنایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

"النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ ۖ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ ۗ" (الاحزاب)

نبی کو مومنین پر ان کے نفسوں سے زیادہ تصرّف ہے۔ اور اسکی بیویاں انکی مائیں ہیں۔

آنحضور صلعم کی محبت ہم سب پر فرضِ عین ہے۔ درحقیقت آپ کی محبت ہی ہمارے ایمان کو مکمل کرتی ہے۔ چنانچہ بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن ہشام رضؓ سے مندرجہ ذیل حدیث منقول ہے :-

حضرت عبداللہ بن ہشام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے، جبکہ آپ حضرت عمرؓ کا ہاتھ

پکڑے ہوئے تھے۔ اور عمرؓ آپ سے عرض کر رہے تھے۔ یا رسول اللہ! آپ مجھ کو سوائے میری جان کے ہر چیز سے پیارے ہیں۔ اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: "نہیں اے عمرؓ! قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، جب تک کہ میں تیری جان سے بھی زیادہ تجھ کو پیارا نہ ہوں گا (جب تک تیرا ایمان کامل نہ ہوگا)" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی "حضور! بے شک آپ مجھ کو میری جان سے زیادہ پیارے ہیں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں اے عمرؓ! اب تمہارا ایمان کامل ہوا۔"

یہ سب مثالیں تو مشتے از خروارے تھیں۔ دراصل اللہ تعالےٰ نے ہمیں آنحضور صلعم کی کامل اطاعت اور آپ سے محبت کا ہر گام پر حکم فرمایا ہے۔ اگر ان احکامات کو نقل کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ اقبالؒ نے قرآن و کتبِ احادیث کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور آپ سے محبت میں ہی ہم سب مسلمانوں کی نجات ہے۔ اللہ تبارک و تعالےٰ کی رضا کا حصول جو ہمارا مقصدِ حیات اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جبکہ ہم آنحضورؐ کی پیروی کریں۔ آئیے اب ہم اقبالؒ کے کلام سے ان کی آنحضرت صلعم سے محبت اور تتبع کے شوق کا جائزہ لیں وہ عشقِ رسولؐ سے مخمور ہو کر آپ کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں۔

(۱)

در دلِ مسلم مقامِ مصطفےٰؐ است
آبروئے ما زنامِ مصطفےٰؐ است

اقبال اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ہر صالح مسلمان کا دل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کی جگہ ہے یا یوں کہئے کہ ہر مسلمان کے دل میں محمد صلعم بسے ہوئے ہیں۔ ہم مسلمانوں کی عزت و توقیر آنحضرت صلعم کے بزرگ نام سے ہی قائم ہے۔ اللہ تبارک و تعالےٰ نے اپنے کلامِ بلاغتِ نظام میں واشگاف الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے: "اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ" یعنی آنحضو صلعم ہمارے نفسوں پر ہم سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔ آپؐ ہمارے دلوں پر قابض ہیں۔ ہماری عزت اسی میں ہے کہ ہم آپ کی پوری طرح اطاعت کریں اللہ تعالےٰ نے جہاں نبی صلعم کا حق ہمارے نفسوں پر قائم کیا ہے وہاں آپکی اطاعت کا بھی حکم دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: "وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ" یعنی جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے درحقیقت خدا کی ہی اطاعت کی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک مومنِ کامل نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ آنحضور صلعم کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز نہ جانے۔ ہماری دینی و دنیاوی فلاح رسولِ مقبولؐ سے منسلک رہنے میں ہی ہے۔

(۲)

طور موجے از غبارِ خانہ اش
کعبہ را بیت الحرام کاشانہ اش

اقبال عشقِ رسولؐ میں بےخود ہیں۔ آپ کے نزدیک آنحضور صلعم کے مقدس گھر سے اڑتی ہوئی خاک کا جھونکا کوہِ طور پر انوارِ الٰہی کی تجلّی کی طرح انسانوں کے لئے راہِ ہدایت کھولتا ہے۔ آپؐ کی رہائش گاہ درحقیقت کعبے کا کعبہ ہے۔ یہاں اقبال اس حقیقت کی طرف اشارہ کناں ہیں کہ طور پر چمکنے والے نورِ ہدایت کی تکمیل آنحضور صلعم کے توسط سے ہی ہوئی۔ اور کعبے کو اس کا صحیح مقام بھی آپ ہی کی بدولت ملا۔ آپ نے شریعتِ الٰہی کی تاسیس و تکمیل فرمائی اور بیت الحرام کی حقیقی حرمت عوام الناس کے دلوں میں جاگزیں کی چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ کعبہ جس میں تقریباً تین سو ساٹھ بت رکھ دیئے گئے تھے وہ اس رجس سے ایسا پاک کر دیا گیا کہ پونے چودہ سو سال سے وہاں ہر وقت اللہ تعالٰی کی عبادت ہوتی رہتی ہے۔ اور ہر سال لاکھوں انسان اس کے گرد طواف کر کے فریضۂ حج ادا کرتے ہیں۔ جس طرح سے کعبہ ہمارے گناہوں کے دھوئے جانے کا ذریعہ بنا ہے۔ بالکل اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے کعبے کو پاکی نصیب ہوئی ہے۔

(۲۳)

کمتر از آنے ز ادقاتش ابد

کاسبِ افزائش از ذاتش ابد

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تبارک و تعالٰے کی انتہائی فرمانبرداری کرتے تھے۔ آپ رضائے الٰہی کو حاصل کر کے مقامِ محمود پا چکے تھے۔ آپکی حیاتِ طیبہ کی ایک آن ایک طویل زمانے سے افضل تھی۔ درحقیقت آپ کی

ذاتِ گرامی قدر سے زمانے نے ترقی حاصل کی ہے۔

(۴)

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش
تاجِ کسریٰ زیرِ پائے اُمتش

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بڑی سادہ تھی۔ زرقانی میں مرقوم ہے کہ آنحضرت صلعم کے لئے بچھونے کا کوئی التزام نہ تھا۔ کبھی معمولی بستر پر، کبھی کھال پر، کبھی چٹائی پر اور کبھی خالی زمین پر آرام فرماتے تھے [1] آپ نے اپنی حیاتِ طیبہ اسی سادگی میں گزاری۔ آپ اپنے فقر پہ نازاں تھے۔ چنانچہ فرمایا کرتے تھے "الفقر فخری" جس قدر مالِ غنیمت آتا تھا۔ آفتاب غروب ہونے سے پیشتر ہی غربا و مساکین اور مستحقین میں تقسیم کر دیا جاتا۔ اپنی پیاری بیٹی فاطمہؓ کو جن کے ہاتھوں میں چکی پیتے پیتے گھٹے پڑ گئے تھے۔ خادم عطا کرنے کی بجائے ورد تعلیم فرماتے ہیں۔ اور اصحابِ صفہ کی ضرورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ آپ نے اس سادگی پسند مزاج کے ساتھ امت کے مزاج کو اس قدر سنوارا کہ قیصر و کسریٰ کے تاج ان کے قدموں میں آ رہے۔ انہوں نے ظلم و استبداد کا قلع قمع کیا۔ اور دنیا میں خیر و رحمت کے قیام کا ذریعہ بنے۔ اقبال آنحضور کی سادہ زندگی کو پیش کر کے شاہانِ وقت کو آپ کی پیروی کی ہدایت کرتے ہیں۔

---

[1] ب۔ جلد دوم صہ ۲۱۴

(۵)

در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

حضرت سلمان منصور پوری رقمطراز ہیں کہ بعثت کا زمانہ جس قدر قریب ہوتا گیا آنحضرت صلعم کے مزاج میں خلوت گزینی کی عادت بڑھتی گئی۔ آنحضرت صلعم اکثر پانی اور ستو لے کر شہر سے کئی کوس پرے سنسان جگہ کوہِ حرا کے ایک غار میں جس کا طول چار گز اور عرض پونے دو گز تھا، جا بیٹھتے اور عبادت کیا کرتے اس عبادت میں تحمید و تقدیسِ الٰہی کا ذکر بھی شامل تھا۔ اور قدرتِ الٰہیہ پر تدبر و تفکر بھی۔ جب تک پانی اور ستو ختم نہ ہوتے شہر نہ آیا کرتے [۱]۔ اقبال آنحضرت صلعم کی اسی ریاضتِ شاقہ کا ذکر کرتے ہیں جو آپ نے ایک عرصہ دراز تک غارِ حرا میں جاری رکھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو مقامِ نبوت پر سرفراز فرمایا۔ آپ نے شبانہ روز تبلیغ سے "امتِ وسطیٰ" کو ترتیب دیا، جس نے نہ صرف ایک وسیع سلطنت قائم کی بلکہ دنیا والوں کو جہانداری و جہانبانی کے اصول و طریق بھی سکھائے۔ چنانچہ تاریخ عالم شاہد ہے کہ مسلمان عربوں نے ایران و روم جیسی عظیم الشّان سلطنتوں کو فتح کیا۔ غلاموں کو آزادی کی نعمت سے ہمکنار کیا۔ اور حکمرانی کا وہ آئین مرتب کیا جس نے انسانوں کو ان کے

۱۔ رحمۃ للعالمین حصہ اوّل صفحہ ۵۲ بحوالہ صحیحین۔

پیدائشی حقوق دے کر ان پر اللہ تعالےٰ کی رحمت تمام کی۔

(۶)

ماند شبہا چشم او محرومِ نوم
تا بہ تختِ خسروی خوابیدہ قوم

مولانا شبلیؒ نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلعم راتوں کو اٹھ اٹھ کر نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ اس عبادتِ شبانہ کے متعلق مختلف صحابہ سے مختلف روایتیں ہیں۔ ایک راوی کا بیان ہے کہ آپ رات بھر نماز میں کھڑے رہے۔ اُم سلمہؓ کہتی ہیں کہ آپ کچھ دیر سوتے، پھر کچھ دیر اٹھ کر نماز میں مصروف ہو جاتے۔ پھر سو جاتے، پھر اٹھ بیٹھتے اور نماز ادا کرتے، غرض صبح تک یہی حالت قائم رہتی۔ ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ آدھی رات کے بعد آپ اٹھتے تھے اور تیرہ رکعتیں ادا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت نو رکعت کی ہے۔ محدثین نے ان سب میں یہ تطبیق دی ہے کہ آپ ان طریقوں میں سے ہر ایک طریقے پر نماز ادا کرتے تھے۔ ہر راوی نے اپنا مشاہدہ بیان کیا ہے [۱]۔ غرضیکہ آنحضرت صلعم اکثر و بیشتر تمام تمام رات عبادت میں منہمک رہتے تھے۔ سجدے میں آپ کی زبانِ حقیقت بیان پر ہمیشہ "یا ربِّ اُمّتی" "یا ربِّ اُمّتی" کے کلمات رہتے تھے۔ اس ریاضتِ شاقہ سے آپ کے پائے مبارک متورم ہو جایا کرتے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔

---

[۱] سیرت النبی حصہ دوم صـ ۲۵۲ بحوالہ زرقانی

يَآ اَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ

اے کپڑا اوڑھنے والے! کھڑا رہا کر رات کو مگر تھوڑا

نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ

آدھی اس کی یا کم کر اس میں سے بھی تھوڑی سی یا

زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۭ (سورہ مزمّل)

بڑھا اس پر کچھ اور قرآن کو آہستہ آہستہ اور واضح پڑھ

اور اس طرح آپ کو ساری رات قیام سے بکمال محبت و نرمی منع فرمایا۔ اقبال فرماتے ہیں کہ آنحضور صلعم کی یہ ریاضتِ شاقّہ صرف اس وجہ سے تھی۔ کہ آپ کی امّت کو دنیا میں سربلندی اور عقبیٰ میں سرخروئی نصیب ہو۔

(۷)

وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز

دیدۂ او اشکبار اندر نماز

مسندِ احمد ابنِ حنبل میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ "جب غزوہ بدر میں زور کا رن پڑا تو ہم لوگوں نے آپ ہی کی آڑ میں آکر پناہ لی۔ آپ سب سے زیادہ شجاع تھے۔ مشرکین کی صف سے اس دن آپ سے زیادہ کوئی قریب نہ تھا۔" صحیح مسلم میں حضرت براءؓ سے روایت نقل ہے کہ "غزوہ حنین میں آنحضرت صلعم اپنی جگہ سے نہیں ہٹے تھے۔ ہم لوگ شدید جنگ میں آپ ہی کے پہلو میں آکر پناہ لیتے تھے۔ ہم میں سب سے بڑا بہادر وہ شمار ہوتا تھا جو آپ کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا۔" اقبال نے اس حقیقت کو عیاں

کیا ہے۔ آنحضورؐ کی تلوار جنگ میں آہن گداز اور خارا شگاف تھی۔ تاہم اس بہادری، شجاعت، بلند ہمتی اور اولوالعزمی کے باوجود جب آپ اللہ تعالےٰ کے حضور میں مصروف نماز ہوتے تھے تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ جب کبھی ہنگامہ کارزار گرم ہوتا تو آپ نہایت خضوع و خشوع اور اطمینانِ قلب کے ساتھ دعا و زاری کرتے اور ذکرِ الٰہی میں مصروف رہتے۔ اقبالؒ کے نزدیک جنگ کے وقت آپ کی آہن گداز شمشیر دشمن کو زیر کرنے اور امت کو دنیاوی وجاہت دلانے کا ذریعہ تھی۔ جبکہ نماز میں آپکی اشکباری امت کے گناہوں کو دھونے اور عقبےٰ میں اسکی سرخروئی کا وسیلہ بن گئی تھی غرضیکہ آپ کے تمام کام جمیع مسلمانوں کی دینوی و دنیاوی فلاح و بہبود کے لئے وقف تھے۔

(۸)

در دعائے نصرت آئین تیغِ او
قاطعِ نسلِ سلاطین تیغِ او

علامہ شبلی نعمانی تحریر فرماتے ہیں کہ عین اس وقت جب دونوں طرف سے فوجیں بر سرِ پیکار ہوتیں، تیر و سناں اور تیغ و خنجر کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو رہی ہوتیں۔ اور ہر طرف سے شورِ دار و گیر برپا ہوتا، آپ نہایت خضوع و خشوع اور اطمینانِ قلب کے ساتھ دعا و زاری اور ذکرِ الٰہی میں مصروف ہوتے۔ اقبال نے اسلامی تاریخ اور احادیثِ نبوی کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تھا چنانچہ اس شعر میں آپ اس حقیقت کو بیان کر رہے ہیں کہ میدانِ جنگ میں

آنحضور صلعم مسلمانوں کی فتح کے لئے بڑے خشوع و خضوع سے اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگا کرتے تھے۔ ان دعاؤں کا اثر "آمین" کہنے سے بڑھ جاتا تھا۔ بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ کیونکہ جس کی آمین ملائکہ کی آمین سے موافق ہو گی اس کے پہلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔" آنحضور صلعم جنگ میں صرف دعائے نصرت کرنا اور آمین کہنا ہی کافی نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ اپنی شمشیرِ خاراشگاف سے استبداد کا خاتمہ بھی کرتے تھے۔ آپ نے انسان کی مرضی کی انسان پر حکومت ختم کر کے اللہ تبارک و تعالےٰ کے احکامات پر مشتمل اسلامی آئین کی حکومت قائم فرمائی۔ اس طرح آپ نے بادشاہت اور مطلق العنانیت کو یکسر ملیامیٹ کر دیا۔ آپ کی ترتیب دی ہوئی حکومت میں قانون کی بنیاد انسانی خواہشات کی بجائے رضائے الٰہی پر قائم ہوئی۔

(۹)

در جہاں آئینِ نو آغاز کرد

مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد

امم سابقہ نے مطلق العنان حکومتوں کو رواج دے رکھا تھا۔ انسان نے انسان کو غلام بنایا ہوا تھا۔ بادشاہ کی زبان سے ادا کئے گئے کلمات قانون کا درجہ رکھتے تھے۔ استبداد کا دور دورہ تھا۔ کہیں کسریٰ غریبوں اور کمزوروں پر ظلم و ستم توڑ رہا تھا تو کہیں قیصر نے انسان کے پیدائشی حقوق کو غصب کر رکھا تھا۔ آنحضور صلعم کی بعثت کے ساتھ دنیا کی کایا ہی پلٹ گئی۔ دنیا میں آئینِ الٰہی

کو حکومت کی بنیاد قرار دے دیا گیا۔ حاکم و محکوم کے بنیادی حقوق مساوی قرار پائے۔ امم سابقہ کے مقام کو نیست و نابود کر کے صالح قیادت کا قیام عمل میں آیا۔ اور دنیا میں عدل و انصاف کا دور دورہ شروع ہوا۔

(۱۰)

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد
ہمچو او بطنِ امِ گیتی نزاد

اقبال اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ مسلمانوں کو دین سے ہی دنیا میں سربلندی حاصل ہوئی ہے۔ عرب ناشائستہ، غیر مہذّب اور پسماندہ لوگ تھے۔ آنحضور صلعم نے دین اسلام کی کلید سے دنیا کا دروازہ کھولا۔ چنانچہ عربوں نے اسلام قبول کرتے ہی ایران و روم کی جابر سلطنتوں کو ختم کر ڈالا۔ اور متمدّن دنیا کے مالک بن بیٹھے۔ دنیا کی ایسی کایا پلٹنے والا کوئی شخص بجز آنحضرت صلعم پیدا نہیں ہوا۔ اس دنیا میں آنحضور جیسی برگزیدہ شخصیّت کسی ماں نے نہیں جنی۔ عربوں کو صراطِ مستقیم پر گامزن کرنے والے سیّد البشرؐ ہی تھے۔ حضرت سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب فرمایا ہے:۔

يَا صَاحِبَ الْجَمَالِ وَيَا سَيِّدَ الْبَشَرِ
مِنْ وَجْهِكَ الْمُنِيرِ لَقَدْ نُوِّرَ الْقَمَرُ
لَا يُمْكِنُ الثَّنَاءُ كَمَا كَانَ حَقُّهُ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(۱۱)

در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

حضرت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں امیر و غریب، صغیر و کبیر، آقا و غلام سب برابر تھے۔ سلمانؓ و صہیبؓ و بلالؓ کہ سب کے سب غلام رہ چکے تھے۔ آپ کی بارگاہ میں رؤسائے قریش سے کم رتبہ نہ تھے۔ ایک دفعہ حضرت سلمانؓ و بلالؓ ایک موقع پر جمع تھے۔ اتفاق سے ابوسفیان نکلے۔ ان لوگوں نے کہا کہ ابھی تلوار نے اس دشمنِ خدا کی گردن پہ پورا قبضہ نہیں پایا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان لوگوں سے کہا "سردارِ قریش کی شان میں یہ الفاظ" پھر آنحضرت صلعم کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا "کہیں تم نے ان لوگوں کو ناراض تو نہیں کیا؟ اگر تم نے ان لوگوں کو ناراض کیا تو خدا کو ناراض کیا" حضرت ابوبکرؓ نے فوراً جا کر ان بزرگوں سے کہا "بھائیو! آپ لوگ مجھ سے ناراض تو نہیں ہوئے" ان لوگوں نے کہا "نہیں، خدا تم کو معاف کرے"[۱] آپ اپنے غلام کے ساتھ ایک دستر خوان پر کھانا تناول فرماتے تھے فرمایا کرتے تھے "یہ تمہارے بھائی ہیں۔ جو خود کھاتے ہو ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنتے ہو وہ ان کو پہناؤ" آپ کے پاس جو غلام آتے ان کو آپ ہمیشہ آزاد فرما دیتے۔ حضرت زید بن حارثؓ آزاد کر دیئے جانے کے باوجود اپنے باپ

---

[۱] سیرت النبیؐ حصہ دوم صـ ۳۳۳ بحوالہ صحیح مسلم۔

کے ساتھ نہ گئے اور آپ کی خدمت میں ہی رہے۔ آپ ان کے لڑکے حضرت اسامہؓ سے بھی محبت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ انہیں بہت سے جلیل القدر صحابہ پر سپہ سالار مقرر فرمایا۔ مال غنیمت جب تقسیم ہوتا تو آپ اس میں سے محتاجوں کو بھی حصہ دیتے۔ جب قبیلہ مخزوم کی ایک عورت چوری کے جرم میں گرفتار ہوئی اور حضرت اسامہؓ نے اس کی سفارش کی تو آپ نے فرمایا "خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ سرقہ کرتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے" غرضیکہ آنحضرت صلعم مساوات کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔[1]

(۱۲ تا ۱۴)

در مصافے پیشِ آں گردوں سریر
دخترِ سردارِ طے آمد اسیر
پائے در زنجیر و ہم بے پردہ بود
گردن از شرم و حیا خم کردہ بود
دخترک را چوں نبیؐ بے پردہ دید
چادرِ خود پیشِ روئے او کشید

علامہ سلمان منصور پوری تحریر فرماتے ہیں کہ ۹ھ میں یمن کے قبیلہ بنی طے نے بغاوت کی تھی۔ اس وقت اس علاقہ کے حاکم اعلیٰ علی مرتضےٰ تھے۔ انہوں نے فسادیوں کو پکڑ کر مدینہ منورہ بھیج دیا تھا۔ ان میں حاتم طائی

---

[1] سیرت النبی حصہ دوم صفحہ ۳۳۳ بحوالہ بخاری و مسلم و ابو داؤد وکتاب الحدود

مشہور سخی کی بیٹی بھی تھی۔ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یوں عرض کیا:۔

"میں سردارِ قوم کی بیٹی ہوں۔ میرا باپ رحم وکرم میں مشہور تھا۔ بھوکوں کو کھانا کھلایا کرتا۔ غریبوں پر رحم کیا کرتا۔ وہ مرگیا۔ بھائی شکست کھا کر بھاگ گیا۔ اب آپ مجھ پر رحم کریں۔"

نبی صلعم نے یہ سن کر فرمایا "تیرے باپ میں مومنوں جیسی صفات تھیں" اس کے بھائی کے مع اس کے متعلقین کے چھوڑ دیا۔ اور زادِ راہ اور لباس بھی عنایت فرمایا۔

حضرت اقبال نے اسلامی تاریخ کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔ ان اشعار میں آپ نے اسی واقعے کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک جنگ میں اس گردوں نشیں (محمد صلعم) کے حضور میں حاتم سردارِ قبیلہ طے کی بیٹی قیدی کی حیثیت سے پیش ہوئی۔ لڑکی پابستہ و بے پردہ تھی۔ اس نے فطری شرم وحیا کی وجہ سے گردن جھکائی ہوئی تھی۔ نبی صلعم نے جب لڑکی کو بے پردہ دیکھا تو اپنی چادر اس کے سر پر اڑھا دی۔ اس واقعے کے بیان سے اقبال آنحضور صلعم کی رحم دلی اور شفقت ظاہر فرما رہے ہیں۔

(۱۵ - ۱۶)

ما ازاں خاتونِ طے عریاں تریم	پیشِ اقوامِ جہاں بے چادریم
روزِ محشر اعتبارِ ماست او	در جہاں ہم پردہ دارِ ماست او

اقبال نے یہاں ہم مسلمانوں کی بے سروسامانی۔ افلاس اور غلامی کا نرالے

انداز میں ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم قبیلۂ طے کی اس خاتون سے جو گرفتار ہو کر آئی تھی زیادہ برہنہ ہیں۔ عورت کی سب سے بڑی ضرورت اس کی سترپوشی ہے۔ لباس ہی اس کی عزت کا سبب ہے۔ ہم مسلمانوں نے آنحضور صلعم کی سنّت پر عمل چھوڑ دیا ہے جس کی وجہ سے جہاں ہمارا اخلاق انحطاط پذیر ہوا وہاں ہم اپنی ملی طاقت، سیاسی قوّت اور مالی سرمایہ بھی ضائع کر چکے ہیں۔ ہم دوسری قوموں سے مغلوب ہو کر ان کے غلام بن چکے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم خاتونِ طے" کی طرح برہنہ سر اور بے عزّت ہیں۔ ہمارا ایمان کمزور ہو گیا ہے اور ہم قعرِ مذلّت میں جا گرے ہیں۔ اس بے چارگی کے عالم میں بھی ہماری امیدیں سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ ہیں۔ وہی دنیا میں ہماری عیب پوشی فرمائیں گے۔ بالکل اس طرح جیسے کہ بنتِ حاتم کا برہنہ سر آپ نے اپنی چادر سے ڈھانپا تھا۔ ہماری دنیاوی اور دینوی ترقیاں آپ ہی کی نظرِ کرم کی محتاج ہیں۔ ہم اس دنیا میں ہی آپ کے دست نگر نہیں بلکہ روزِ حشر بھی آپ ہی کے محتاج ہیں۔ بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے آنحضور صلعم سے سنا کہ فرماتے تھے "جب قیامت کا دن ہوگا، تو میں شفاعت کروں گا اور کہوں گا، اے پروردگار! ان لوگوں کو جنّت میں داخل کر جن کے دل میں رائی برابر بھی ایمان ہے۔ چنانچہ وہ لوگ داخل کئے جائیں گے۔ پھر میں کہوں گا، اے اللہ! جن کے دل میں ذرّہ بھر بھی ایمان ہے اُن کو بھی داخلِ جنّت کر"۔ الغرض ہم مسلمانوں کی دنیاوی عقبیٰ کی فلاح و بہبود آنحضور صلعم کی نظرِ کرم کی مرہونِ منّت ہے۔

(۱۷)

لطف و قہرِ او سراپا رحمتے
آں بیاراں ایں باعدا رحمتے

اقبالؒ کا دعویٰ ہے کہ آنحضور صلعم کا لطف و قہر دونوں دنیا والوں کے لئے رحمت ہیں۔ قرآنِ کریم میں ارشاد باری تعالےٰ ہے :۔

"فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ"

(سورہ آلِ عمران)

اللہ تبارک و تعالےٰ کی رحمت سے تو
(محمدؐ) ان (مسلمانوں) پر بیحد نرم و مہربان ہے

آنحضور صلعم جہاں مسلمانوں کی معاشی و معاشرتی اصلاح کے لئے جد و جہد فرما رہے تھے وہاں ان کی دینی بہبود کے لئے بھی کوشاں تھے۔ مسلمانوں کی دینی کوتاہیوں کے لئے آپ بارگاہِ الٰہی میں استغفار فرمایا کرتے اور سجدوں میں "یَا رَبِّ اُمَّتِیْ" "یَا رَبِّ اُمَّتِیْ" کا وِرد زبان پر ہوا کرتا۔ غرضیکہ رسول اللہ صلعم امت پر اپنی اولاد کی طرح مہربان تھے۔ آپ کا غصّہ کافروں اور مشرکوں کے لئے تھا جو ان کے سدھار کا موجب بنا کرتا۔ اور اس طرح ان کے لئے رحمت بن جایا کرتا تھا۔ غزوات کے واقعات شاہد ہیں کہ لاتعداد مشرکین اور کافرین نے مسلمانوں کی فتح پر معرفتِ حق حاصل کی۔ اقبال نے قرآن کریم کا مطالعہ دقیق النّظری سے کیا ہے۔ اگر غور و خوض سے کام لیا جائے تو ہم پر یہ حقیقت واضح ہو گی کہ اقبالؒ نے جب یہ شعر کہا تو ان کے پیشِ نظر قرآن کریم کی آیت

"وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ" (اور نہیں بھیجا ہم نے تجھے (اے محمدؐ) مگر رحمت دونوں عالموں کے لئے) تھی۔ غرضیکہ آنحضور صلعم تمام دنیا والوں کے لئے بلا تخصیص مذہب وملت اللہ تبارک وتعالےٰ کی طرف سے رحمت تھے۔

(۱۸)

آں کہ بر اعدا درِ رحمت کشاد
مکّہ را پیغام لا تثریب داد

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ آنحضور صلعم نے فتحِ مکّہ پر دشمنوں کے لئے رحمت کا دروازہ کھول دیا تھا۔ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ جب ۸ھ میں آپ نے مکّہ فتح کیا اور اسلامی لشکر کے ساتھ مکّے میں داخل ہوئے تو آپ نے مکّہ والوں کے ان مظالم کے باوجود جو انہوں نے آپ کی ہجرت مدینہ سے پہلے روا رکھے تھے "لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ" (آج کے دن تم پر کوئی گرفت نہیں) فرمایا، اور ابو سفیان اور اسی قبیل کے دوسرے جانی دشمنوں کو معاف کر دیا۔ یہ واقعہ آپ کے عفوو درگذر کے بے مثال ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ دوسرا شخص خواہ وہ کتنا ہی حلیم و بردبار کیوں نہ ہوتا یقیناً کچھ نہ کچھ خونریزی ضرور روا رکھتا۔ آنحضرت صلعم تو رحمۃ اللعالمین تھے۔ آپ نے تو اپنے پیارے چچا حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے حبشی قاتل کو بھی معاف کر دیا تھا اور ہندہ جیسی شقی القلب عورت سے بھی کوئی مواخذہ نہ کیا۔ حالانکہ اس نے غزوۂ احد کے دن ان کا کلیجہ چبایا تھا۔ آپ کے عفوو کرم کی

مثال نہ تو دنیا ماضی میں پیش کر سکی اور نہ ہی کبھی مستقبل میں پیش کر سکے گی۔

(۱۹ - ۲۰)

ماکہ از قیدِ وطن بیگانہ ایم
چوں نگہ نورِ دو چشم و یکیم
از حجاز و چین و ایرانیم ما
شبنم یک صبحِ خندانیم ما

اقبالؒ کا کہنا ہے کہ ہم مسلمان وطن کی قید کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ہم دنیا کے کسی حصے میں رہیں دونوں آنکھوں کے نور کی طرح یکجان ہو کر ایک ہی رہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم حجاز، چین اور ایران کے رہنے والے ہونے کے باوجود صبح صادق کے وقت پڑنے والی پاک اور چمکدار شبنم کی مانند ہیں۔ ہم سب ایک ساتھ ہی شبنم کے قطرات کی طرح آفتاب نورِ ہدایت کے لئے اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر آنحضور صلعم کے نام پر ہماری جانیں نچھاور ہیں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے ہم اپنی عالمگیر اخوت کا مظاہرہ کیا کرتے ہیں۔

(۲۱ - ۲۲)

مستِ چشمِ ساقیٔ بطحا ستیم
در جہاں مثلِ مے و مینا ستیم

ہم سب مسلمان شرابِ معرفت پلانے والے خاتم النبیین، رحمۃ اللعالمین حضرت محمد صلعم مدنی کی مخمور آنکھ سے مست و مسحور ہو گئے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں صراحی و شراب کی طرح سے دوامی ربط رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں

میں یوں کہیئے کہ ہم تمام مسلمان آنحضرت صلعم کے عشق میں مست و بے خود ہیں اور ایک ہی چشمے سے سیراب ہونے والوں کی طرح یک جا ہیں۔ ہمارا خدا ایک، رسُول ایک اور قرآن بھی ایک ہی ہے۔ چنانچہ ہم ایک ہی امت ہیں جسے خداوند تعالےٰ نے "امتِ وسطےٰ" کا خطاب دیا۔ نیز ہمارے دین کو "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام" فرما کر اس پر اپنی خوشنودی کی مہر ثبت فرمادی۔

(۲۳)

امتیازاتِ نسب را پاک سوخت
آتشِ او این خس و خاشاک سوخت

اقبالؒ اس مسلمہ حقیقت کا اظہار کر رہے ہیں کہ آنحضور صلعم نے سب انسانوں کو اللہ تعالےٰ کی مخلوق سمجھتے ہوئے یکساں ہی جانا۔ آپ نے نسلی اور نسبی امتیازات کو یکسر مٹا دیا۔ اور ان زوائد یعنی گھاس پھوس کو جلا کر راکھ کر ڈالا۔ ارشادِ باری تعالےٰ ہے:۔

"اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ"
اللہ تعالےٰ کے نزدیک تم میں شریف تر
وہ ہے جو کہ زیادہ پرہیزگار ہے۔"

آنحضور صلعم نے حجۃ الوداع کے خطبے میں فرمایا "تمہارا خدا ایک، تمہارا باپ ایک تم سب آدم کی اولاد ہو۔ اور آدم مٹی کے تھے"۔ صاف ظاہر ہے کہ تمام بنی نوع انسان ایک ہی ہیں اور ان میں خلقی اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ قبیلے تو صرف ایک دوسرے کے تعارف کے لئے ہیں۔ وگرنہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک

افضل وہی ہے جو زیادہ متقی ہے۔ تاریخِ اسلام شاہد ہے کہ آنحضور صلعم نے اپنے غلام زید بن حارثؓ اور غلام زادے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو مہاجر و انصار پر سپہ سالار بنایا۔ جب اسامہ بن زیدؓ کو ایک جنگی مہم پر بھیجا جاتا تو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسے مقرب و مقتدر صحابہ کو ان کی ماتحتی میں رکھا۔ اور انہیں محسن ہوتے ہوئے ایک نوجوان کی اطاعت کا حکم ملا۔

(۲۴)

ہمچوں گل صد برگ ما را بو یکیست
اوست جانِ ایں نظام و او یکیست

اقبال یہاں فنا فی الرسول کے مقام پر کھڑے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جیسے گلاب کی سو پنکھڑیوں کی خوشبو ایک ہی جیسی ہوتی ہے بالکل اسی طرح ہم سب مسلمانوں کا اخلاق بھی ایک ہی بنیاد پر قائم ہونے کی وجہ سے یکساں ہے۔ ملتِ اسلامیہ ایک ملی نظام ہے جس کی روحِ رواں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں غرضیکہ ہمارا اٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا، مرنا جینا، سب آنحضور صلعم کی سنت میں رضائے الٰہی کے لئے ہی ہے۔

(۲۵)

سرِّ مکنونِ دلِ او ما بدیم
نعرہ بے باکانہ زد افشا شدیم

ہم آنحضور صلعم کے دل کے رازِ سربستہ تھے۔ چنانچہ جب آپ نے بے خوف و خطر توحیدِ الٰہی کی تبلیغ شروع کی تو ہم ایمان لاکر ملتِ اسلامیہ کی صورت

اختیار کر گئے۔ آپ کے دل میں ہمیشہ امت کی فلاح و بہبود کا خیال جاگزیں رہتا تھا۔

(۲۶)

شورِ عشقش در نئے خاموشِ من
می تپد صد نغمہ در آغوشِ من

اقبال عاشقِ رسولِ صلعم ہیں۔ فرماتے ہیں: "محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق نے میرے پرسکون دل میں ہیجان برپا کر دیا۔ جس کی بنا پر میرے سینے میں سینکڑوں نغمے بے تاب ہیں۔" اقبال کا دِل سوزِ عشقِ حقیقی سے بےگانہ نہ تھا جوں ہی عشقِ رسولؐ ان کے دِل میں پیدا ہوا، شعلۂ عشق نے روح کو حقیقت سے آشنا کرنے کے لیے سینے کی بھٹی میں خوب تپایا اور اس طرح مس خام کو کیمیا بنا دیا۔ اگر ہم غور و خوض کریں تو اس حقیقت کو پالیں گے کہ اقبال کی حقیقت طرازی اور حق گوئی عشقِ رسولؐ کی ہی مرہونِ منّت ہے۔

(۲۷)

من چہ گویم از تولّایش کہ چیست
خشک چوبے در فراقِ او گریست

اقبالؒ فرماتے ہیں: "میں عشقِ رسولؐ کی ماہیت اور اس کی تاثیر کیا بیان کروں کہ وہ احاطۂ تقریر سے باہر ہے۔ ان کے عشق نے تو خشک لکڑی پر بھی اثر کیا تھا۔ چنانچہ وہ آنحضرتؐ کی جدائی کے درد کی تاب نہ لا کر رونے لگی تھی۔" حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے عشقِ رسولؐ میں سرشار ہو کر احادیثِ نبوی کا

بڑی عقیدت سے مطالعہ کیا ہے۔ احادیث پڑھتے وقت وہ فلسفے کے معراد کبریٰ کو بھلا دیا کرتے تھے اور عقیدت مند مسلمان بن جاتے تھے۔ ایک فلاسفر کے نزدیک چوبِ خشک کا رونا بے معنی ہے۔ وہ تو عقل کا بندہ ہوتا ہے۔ لہٰذا جو بات اس کی عقل میں نہ آئے اسے ردّ کرتا چلا جاتا ہے۔ معجزات پر ایمان ایک مسلمان ہی لایا کرتا ہے۔ لہٰذا اس کے نزدیک چوبِ خشک کا عشقِ رسول میں رونا قابلِ تسلیم ہے۔ بخاری شریف میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ ایک ستون (حنّانہ) تھا جس پر ٹیک لگا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوتے تھے۔ پھر جب آپ کے لئے منبر رکھ دیا گیا تو حاضرین نے ستون سے حاملہ اونٹنیوں جیسی آواز سنی۔ یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اپنا ہاتھ رکھا۔

ظاہر ہے کہ ستون کا آنحضورؐ کے فراق میں آہ و زاری کرنا مبنی بر عشق ہی تھا۔

(۲۸)

ہستیِ مسلم تجلّی گاہِ او
طورہا بالد ز گردِ راہِ او

آنحضورؐ آفتابِ نورِ ہدایت تھے۔ مسلمِ کامل کی روح آپ کی جلوہ گاہ ہے۔ ہم جب کبھی کسی سنّتِ رسولؐ پر گامزن مسلمان کی زندگی کا مطالعہ کریں گے۔ تو سرچشمۂ ہدایت یعنی رسولِ مقبول صلعم کی معرفت حاصل کرلیں گے۔ اس خورشیدِ نورِ ہدایت کی گردِ راہ سے جلوۂ طور پیدا ہوتے ہیں۔ ایک سچا مسلمان

ہی اس منبعٔ نورِ ہدایت سے کسبِ فیض کر سکتا ہے۔ آپ کا راستہ ہی صراطِ مستقیم ہے اور تمام راستے جو نجات کا ذریعہ بن سکیں وہ اسی شاہراہِ اعظم سے نکلتے ہیں۔ ہر اُس شخص نے دنیا میں عزت اور عقبیٰ میں سرخروئی حاصل کی جس نے کہ آنحضور صلعم کی پیروی کی۔

کوہِ طور پر اللہ تعالیٰ کی تجلّی بنی اسرائیل کی ہدایت کا ذریعہ بنی، ورنہ انہوں نے تو بغیر مشاہدہ کے اللہ تعالیٰ کو بھی ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ جیسی ہدایت کوہِ طور کی تجلّی سے حاصل ہوئی ویسی ہی ہدایتیں آنحضور صلعم کے چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے سے انسانوں کو میسّر آئیں۔ آپ "خلقِ عظیم" کے مالک تھے۔ چنانچہ آپ کے اخلاقِ حسنہ سے متاثر ہو کر ہزاروں لاکھوں انسان ایمان سے بہرہ ور ہوئے۔ آپ کا عشق ہر سچے مسلمان کے دل میں جاگزیں ہے۔ وہی اس کا سرمایۂ حیات ہے اور اسی میں فنا ہونا اس کی معراج ہے۔

(۲۹)

پیکرم را آفرید آئینہ اش

صبحِ من از آفتابِ سینہ اش

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے پیکر کو حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلّم کا آئینہ بنایا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اقبال کا دل آئینہ کی طرح صاف وشفاف ہے۔ اور آفتابِ نورِ ہدایت (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی شعاعیں اس میں منعکس ہو کر روشنی پیدا کرتی ہیں۔ اقبال اپنے دل میں ہدایت کی روشنی کا باعث آنحضور صلعم کی روشن ذات کو ہی قرار دیتے ہیں۔ جیسے

شفاف آئینے پر جب تک خورشید کی روشنی نہ پڑے وہ روشن نہیں ہوتا بالکل اسی طرح اقبال کا شفاف دل اس وقت تک نور ہدایت سے معرا رہا جب تک کہ آنحضور صلعم سے اس کا رابطہ قائم نہ ہوا تھا۔ جیسے ہی اس نے آنحضرت صلعم سے قلبی تعلق قائم کیا اُن پر حقائق روشن ہو گئے۔

بات دراصل یہ ہے کہ اقبال آنحضور صلعم کی محبت میں سرشار ہیں ان کے نزدیک آپ کی ذات ہی منبع نورِ ہدایت ہے۔

(۳۰)

در تپیدن می بدم آرامِ من
گرم تر از صبحِ محشر شامِ من

اقبال کے لئے عشقِ رسول میں ہر دم جلتے رہنا سکونِ قلب کا باعث ہے الیں عاشقِ صادق کو سوزِ عشق میں ہی آرام ملتا ہے۔ اس کی رُوح گدازِ عشق کی عادی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ فراقِ رسول میں دِل کی تڑپ روزِ محشر کے اضطراب سے کہیں زیادہ ہے۔ لیکن درحقیقت اس انتہائی سوز میں ہی اسے اطمینانِ قلب میسر آتا ہے۔ سچ ہے عاشقِ صادق کے لئے سوز و گدازِ عشق ہی سرمایہ حیات ہے۔

(۳۱)

ابرِ آذر است و من بُستانِ او
تاک من نمناک از بارانِ او

علامہ فرماتے ہیں: "آنحضور صلعم موسمِ بہار کے ابر کی مانند ہیں اور میں ان کا

چمن ہوں ۔ جیسے ابرِ آذر کی پہلی بارش باغ کو پیغام فروغ دیتی ہے ۔ اور ہر طرف موسمِ بہار کا دور دورہ ہو جاتا ہے ۔ بعینہٖ آنحضور صلعم سے انوارِ ہدایت کی بارش ہوتی ہے ۔ جس سے میرے دل کے چمن میں بہار آجاتی ہے اور میں مقصدِ حیات کو پا لیتا ہوں ۔ میری زندگی (انگور کی بیل) آنحضرت صلعم کے بارانِ رحمت سے سیراب ہو کر نشو ونما پاتی ہے ۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ شرابِ معرفت کے فیض کی جو سبیل مجھ سے رواں ہے ، اس کا ذخیرہ ، منبع و سرچشمہ آپ ہی ہیں ۔"

(۳۲)

چشم در کشتِ محبت کاشتم
از تماشا حاصلے برداشتم

فرماتے ہیں "میں نے محبت کی کھیتی کی آبیاری اپنے آنسوؤں سے کی ہے ۔ جب میری یہ کھیتی تیار ہوئی تو میں نے دیدارِ معشوق سے بہرہ اندوز ہو کر گرانمایہ پیداوار اٹھائی ہے ۔" عاشق کے لیے معشوق کا جلوہ سرمایۂ حیات ہے ۔ چنانچہ اقبال بھی مختلف ذرائع سے معرفت و دیدارِ رسول حاصل کر کے ایمان کے گراں قدر سرمائے کو اکٹھا کر رہے ہیں ۔ آپ عاشقِ رسول اللہ ہیں چنانچہ آپ کے لئے معرفت و دیدارِ رسول صلعم زندگی کا اوّلین مقصد ہوتے ہوئے لازوال دولت بھی ہے ۔

(۳۳)

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

علامہ اقبال مدینے کی خاک کو دنیا و عقبیٰ پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس فوقیت کی وجہ یہ ہے کہ رسولِ کریم صلعم کا مزارِ مبارک اسی مقدس شہر میں ہے۔ سچ یہی ہے کہ معشوق کی موجودگی میں لق و دق صحرا آباد شہر سے زیادہ پُر رونق ہے۔ اور اس کی عدم موجودگی میں آباد و پُر رونق شہر ویرانے سے زیادہ سنسان اور وحشت ناک ہے۔ اقبال عاشقِ رسولؐ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ گنبدِ خضرا کی موجودگی کے باعث مدینہ انہیں ہر دو عالم سے عزیز تر ہے۔

(۳۴)

کشتۂ اندازِ ملّا جامیم

نظم و نثرِ او علاجِ خامیم

مولانا عبدالرحمٰن جامی مشہور و معروف فارسی شاعر ہیں۔ آپ نے آنحضور صلعم کی محبت میں بہت سی غزلیں لکھی ہیں۔ آپ کا نعتیہ کلام مقبولِ خاص و عام ہے۔ اس سلسلے میں آپ تمام ایرانی شعرا پر سبقت لے گئے ہیں۔ آپ کی نثر بھی عشقِ رسول صلعم کی آئینہ دار ہے۔ آپ کی یہی ادا تھی جو اقبال کو بھا گئی۔ چنانچہ اقبال اس شعر میں اُن سے اپنی عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہوئے اُن کی نظم و نثر کو اپنے مرض کا علاج قرار دیتے ہیں اور انہیں راہِ عشقِ رسولؐ میں راہنما تسلیم کرتے ہیں۔

(۳۵)

شعر لب ریز معانی گفتہ ام

در ثنائے خواجہ گوہر سفتہ ام

اقبال فرماتے ہیں: "میں نے معانی سے بھرپور شعر کہے ہیں اور اس طرح اپنے آقا کی مدح میں درہائے گرانمایہ نظم کی لڑی میں پرو دیئے ہیں" حقیقت بھی یہی ہے کہ آپ کے اشعار اسی لئے پرمعنی اور دلفریب ہیں کہ ان میں حضرت رسول مقبول صلعم کی مدحت کی گئی ہے۔

(۳۶)

"نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست" ؎۱

آخر میں اقبال نے مولانا جامی علیہ الرحمۃ کا شعر نقل کر کے اپنے جذبات کو تسکین دی ہے۔ آپ اس شعر کے مفہوم کے سلسلے میں مولانا سے پوری طرح متفق ہیں بے شک سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم آفرینش کائنات کا سبب اوّل ہیں۔ یہ ایک مشہور حدیث ہے کہ آنحضور صلعم نے فرمایا: "سب سے پہلے اللہ تعالے نے میرے نور کو پیدا کیا۔"
(اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ) نیز یہ بھی فرمایا: "میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم علیہ السلام مٹی و پانی میں ہی تھے۔ یعنی ان کی تخلیق ابھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچی تھی۔" اسی وجہ کی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ تمام بنی نوع غلام ہیں اور آپ سب کے آقا ہیں۔ ایک اور مشہور حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ آنحضور صلعم نے فرمایا: "میں اولادِ آدم کا سردار ہوں لیکن اس کے باوجود میں اس فخر

؎۱ اسرار و رموز از اقبال ص۲۳ تا ۲۳

پر فخر نہیں کرتا (اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ) ایک حدیث قدسی بھی ہے۔ (لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ) یعنی اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ اے میرے محبوب! اگر میں آپ کو پیدا نہ کرتا تو اس کائنات کو بھی نہ بناتا۔ غرضیکہ آنحضور صلعم ہی زبدۂ کائنات ہیں۔

شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو
از حدودِ مصطفےٰ بیروں مرو [۱]

علامہ اقبال کے نزدیک تربیتِ خودی کے تین مرحلے ہیں، جن میں پہلا مرحلہ "اطاعت" ہے۔ آپ نے اطاعت پر بہت زور دیا ہے۔ یہی تربیتِ خودی کی منزلِ اوّل ہے۔ اس شعر میں اقبال تہذیبِ جدید کے دلدادہ مسلمان نوجوانوں کو ہدایت فرما رہے ہیں کہ انہیں شریعتِ اسلام کی پابندیوں کا شکوہ نہیں کرنا چاہیے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ آنحضرت صلعم کی پیروی کرے اور خدائی قیود کو نہ توڑے۔ آنحضور صلعم کی بحکم خدا مقرر کردہ حدود سے قدم باہر نکالتے ہی انسان گمراہی کے صحرا میں داخل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا انسان کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کی نازل کی ہوئی شریعت پر گامزن رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صراطِ مستقیم بال سے باریک تر اور تلوار کی دھار سے تیز تر راستہ ہے۔ بایں ہمہ مومنین کو اسی پر چلنے میں لطف آتا ہے۔

---

۱ اسرار و رموز از اقبال صفحہ ۴۶ (در بارہ مرحلۂ اول اطاعت)

سعدی نے کیا خوب کہا ہے :۔

محال است سعدی کہ راہِ صفا   تواں رفت جز در پئے مصطفٰےؐ

خلافِ پیمبر کسے راہ گزید   کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

اقبال بھی سعدی کے ہی ہمنوا ہیں۔ وہ ہر مسلمان کو اطاعتِ رسول صلعم میں پختہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالےٰ نے فرمایا ہے "مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ" یعنی جس نے رسول مقبول صلعم کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔ لہٰذا رسول اللہ کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردن سے نکالنے والا اللہ تعالےٰ کی اطاعت سے نکل گیا اور گمراہ ہوا۔ پس کسی مسلمان کو یہ زیبا نہیں کہ اسلامی شریعت کی پابندیوں کا گلہ کرے اور گمراہ ہو

---

(۱)

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا

اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا

اقبال "آنحضور صلعم سے والہانہ عشق رکھتے ہیں۔ لہٰذا اُن کی قدم بوسی کی تمنا اس دنیا میں کرتے ہوئے مستدعی ہیں "اے زمانے کے سفید و سیاہ گھوڑے کے راکب! اس دنیا کو پھر تیری ضرورت ہے۔ پس نزولِ اجلال فرما کہ تو ہی قدرت کی آنکھ کا تارا ہے" تاریخ شاہد ہے کہ آنحضرتؐ نے زمانے کی قدریں بدل ڈالیں اور اسے اپنا مطیع بنا لیا۔ جہاں آپ تشریف لے گئے فتح و ظفر نے آپ کے قدم چومے۔ آپ نے ہی فطرت کو سنوارا اور دینِ فطرت کو

بامِ عروج پر پہنچایا۔ اقبال کا خیال ہے کہ دنیا قعرِ مذلت میں گر گئی ہے اور اسے اب ایک ناجی کی ضرورت ہے۔

(۲)

رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو
در سوادِ دیدہ ہا آباد شو

"یا رسول اللہ! تشریف ارزانی فرماکر اس دنیا کی رونق کا باعث بن جائیے اور ہماری آنکھوں کی پتلیوں کو آباد کیجئے۔" اقبال عشقِ رسولؐ میں بے خود ہیں۔ چنانچہ آنحضور صلعم کا حسنِ جہاں افروز ان کی آنکھوں کی رونق ہے۔ اب آنحضور صلعم کی تشریف آوری کے اس لیے متمنی ہیں کہ اُن کی جلوہ افروزی ادیانِ باطل کے لئے موت کا پیغام ہوگی۔ اور دینِ حق کا بول بالا ہوجانے کی وجہ سے دنیا آباد اور پر رونق ہوجائے گی۔ اللہ تبارک و تعالےٰ نے آنحضور صلعم کو عطا کیے ہوئے دین کے لئے فرمایا ہے "قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا" یعنی کہہ دے (اے رسولؐ کہ تیری آمد سے) حق آگیا اور باطل چلا گیا، بتحقیق باطل جانے ہی والا ہوتا ہے۔

(۳)

شورشِ اقوام را خاموش کن
نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن

"یا رسولُ اللہ! دنیا کی قومیں برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ آپ کی دنیا میں

تشریف آوری سے پہلے بھی ایک قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی تھی۔ آپ جب تشریف لائے تو آپ نے انسانوں کو تعلیم امن و آشتی دی۔ یہاں تک کہ دنیا کی شورش جاتی رہی۔ چنانچہ اب پھر آپ کی ضرورت درپیش ہے۔ تاکہ دنیا میں پھر امن و آمان قائم ہو۔ آپ کا نغمۂ محبت دنیا والوں کی روحوں کو مسحور کرنے والا ہے۔ اور یہی راگ انسانوں کے سکونِ قلب کا باعث ہے۔"

اقبال کے نزدیک شورشِ عالم کا علاج دینِ اسلام کی ترویج ہی ہے۔

(۴)

خیز و قانونِ اخوت ساز دہ
جامِ صہبائے محبت باز دہ

آنحضور صلعم نے گورے کالے کا امتیاز مٹا ڈالا۔ آقا اور غلام کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا۔ شریعتِ اسلام کے تحت مہاجرین کا انصار سے بھائی چارہ کرایا اور اُن میں جذبۂ اخوت یہاں تک پیدا کیا کہ انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کو اپنی املاک کا آدھوں آدھ دے ڈالا۔ وہ ایک دوسرے کے وارث ہونے لگے۔ ایثار کے اس جذبے نے یہاں تک عروج پایا کہ جس انصاری کے پاس دو بیویاں ہوتی تھیں وہ ان میں سے ایک کو طلاق دے کر اپنے مہاجر بھائی کے نکاح میں دے دیتا تھا۔ اقبال اسی قانون کا نفاذ دوبارہ چاہتے ہوئے آنحضور کی دوبارہ تشریف آوری کی استدعا کرتے ہیں تاکہ بھائی چارے سے دلوں میں ملاپ کرانے والا قانون پھر سے

اس دنیا میں رائج ہو۔ اور محبت کی شراب سے اہلِ دنیا دوبارہ سیراب ہوں۔ تاریخِ عالم شاہد ہے کہ ملکِ عرب میں قبائل ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ ان میں معمولی معمولی معاملات پر جنگ چھڑ جایا کرتی اور غارتگری و خونریزی چالیس چالیس، پچاس پچاس سال تک رہا کرتی تھی۔ چنانچہ قبیلۂ بکر اور قبیلۂ تغلب کی لڑائی جو ایک معمولی بات پر شروع ہوئی تھی پورے پچاس سال جاری رہی۔ آنحضور صلعم نے عربوں میں محبت پیدا کی اور دشمنوں تک کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا۔ وہ لوگ جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے ایک دوسرے پر جان قربان کرنے لگے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے ارشاد۔ "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ" (الحجرات) (یعنی سب ایمان والے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ یہی بات پکی ہے) پر ان لوگوں نے عمل کیا، اسی جذبۂ اخوت کے وقت سب نے مل کر اسلام کی رسی کو مضبوطی سے پکڑا اور دنیا میں قیامِ امن کا باعث بنے۔

(۵)

باز در عالم بیار ایام صلح

جنگجویاں را بدہ پیغام صلح

"یا رسول اللہ! دنیا میں تشریف لا کر دوبارہ صلح و آشتی پیدا کیجئے اور جنگ کے متلاشی و خوگر انسانوں کو صلح و محبّت کا درس دیجئے۔"

تاریخِ عالم شاہد ہے کہ آنحضور صلعم نے دنیا میں امن و امان قائم کیا اور جنگجو دشمنوں کو مخلص دوستوں میں بدل دیا۔ وہ لوگ جو کل دشمن تھے آج ایک دوسرے

پر جانیں نثار کرنے لگے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے "لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ" (زمین میں بدامنی پیدا نہ کرو) فرما کر مسلمانوں کو صلح جوئی اور افہام و تفہیم کا پیغام دیا اور قتل و غارت گری کی مذمّت فرمائی۔ نیز "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا" (سب مل کر اللہ تعالیٰ کی رسّی یعنی قرآن و دینِ اسلام کو مضبوطی سے پکڑو اور الگ الگ نہ ہو جاؤ) فرما کر یک جہتی اور اتّفاق کا حکم دیا۔

(۶)

نوعِ انساں مزرع و تو حاصلے

کاروانِ زندگی را منزلے

"یا رسول اللہ! بنی نوعِ انسان کی کھیتی کا حاصل (سرمایہ) آپ ہی ہیں۔ حضرت آدمؑ، حضرت شیثؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ نے دینِ اسلام کی کھیتی کی آبیاری کی اور آپؐ نے اس سے پیداوار حاصل کی۔ آپ خاتم النّبیین ہونے کے باعث زندگی کے قافلے کی آخری منزل ہیں۔"

اقبال آنحضور صلعم کی پیروی کو ہی انسان کی زندگی کا مقصد قرار دیتے ہیں چنانچہ ان کے نزدیک جس کسی نے آپ کی سنّت پر عمل کرنا اپنا شعار بنایا۔ اس نے اپنی زندگی کا مقصد حاصل کر لیا اور نجات پا گیا۔

(۷)

ریخت از جورِ خزاں برگِ شجر

چوں بہاراں بر ریاضِ ما گذر

اقبال کا دل اس بات پر کڑھتا ہے کہ گردشِ زمانہ کی وجہ سے مسلمان نکبت و افلاس کا شکار ہیں اور ان پر تنزل مسلط ہے، جس کے باعث وہ اپنی تمام خوبیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ لہٰذا وہ مستدعی ہیں کہ آنحضور صلعم دوبارہ ان پر اپنے فضل و کرم کی بارش کریں تاکہ راہِ ہدایت حاصل ہو اور وہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہو سکیں۔

(۸)

سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر
از جبینِ شرمسارِ ما بگیر

اقبال فرماتے ہیں "یا رسول اللہ! ہم مسلمان اپنے گناہوں پہ بہت نادم ہیں اور ہماری اٹھی ہوئی پیشانیوں میں آپ کے حضور سجدہ کرنے کی آرزو تڑپ رہی ہے۔ لہٰذا آپ تشریف لائیں تاکہ ہماری یہ دلی آرزو پوری ہو۔"

یہاں اقبال نے عام مسلمانوں کی رسول اللہ سے والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے۔ مسلمان بوڑھا ہو یا جوان، یہاں تک کہ خواہ کمسن ہی کیوں نہ ہو آنحضور صلعم کے حضور میں تعظیماً خمیدہ سر ہی رہتا ہے۔ عامۃ المسلمین گناہگار ہوتے ہوئے بھی آنحضرت صلعم سے محبت کا رشتہ استوار کیے رہتے ہیں۔

(۹)

از وجودِ تو سر افرازیم ما
پس بہ سوزِ این جہاں سوزیم ما[۱]

---

[۱] اسرار و رموز از اقبال ص ۵۱-۵۲ (مرحلۂ سوم نیابتِ الٰہی)

آنحضور صلعم کی قدمبوسی کے ضمن میں علامہ آخری بات یہ فرماتے ہیں کہ آپ کی حیاتِ طیبہ ہی ہم سب مسلمانوں کی سرفرازی کا باعث ہے۔ ہم آپ کی سنّت پر چل کر ہی معزز و موقر رہ سکتے ہیں۔ آپ کی محبت کا سوز ہی خواہشاتِ نفسانی اور دنیائے دوں کی محبت کو نیست و نابود کرتا ہے۔ اقبال نے درست فرمایا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جس کے دل میں رسول اللہ کا عشق جاگزیں ہو وہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی اللہ تعالےٰ سے منسلک رہتا ہے۔ اس کے نزدیک آنحضور صلعم کی سنّت پر چلنا ہی مقصدِ حیات کا حصول ہے۔ حضرت مولانا جلال الدین رومی فرماتے ہیں:

چیست دنیا از خدا غافل بُدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

پس سوزِ عشقِ رسول سے اس جہان کو جلانے کا مطلب ترکِ خواہشات سفلی ہے۔

علمِ حق غیر از شریعت ہیچ نیست
اصلِ سنّت جز محبت ہیچ نیست [۱]

اقبال فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالےٰ کی معرفت شریعتِ اسلام کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتی ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی صرف

---

[۱] اسرار و رموز ص ۱۲۶ ، "کہ پختگی سیرتِ ملیہ از اتباعِ آئینِ الٰہیہ است"

محبت کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ رسول مقبول صلعم کی محبت ہم کو آپ کی سنت پر چلنے کے قابل بناتی ہے، آپ کی سنت پر چل کر ہم شریعتِ اسلام کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور جب ہم شریعتِ اسلام کے تقاضوں کو پورا کرنے لگتے ہیں تو اللہ تبارک و تعالےٰ کی معرفت حاصل کر لیتے ہیں۔ بس یہ سمجھیے کہ آنحضور صلعم کی محبت ہی ہمارے لیے معرفتِ الہیٰ کے حصول کا باعث ہے۔

اللہ تبارک و تعالےٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ

آج میں نے پورا کر دیا تمھارے واسطے تمھارا دین اور پوری کر دی اپنی

وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ۔ (المائدہ پارہ ۶)

نعمت تم پر اور پسند کیا تمھارے واسطے دینِ اسلام کو۔

بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن ہشامؓ سے روایت ہے کہ آنحضور صلعم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا۔ "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ جب تک کہ میں تیری جان سے بھی زیادہ تجھ کو پیارا نہ ہوں گا تیرا ایمان کامل نہ ہوگا" اور حضرت عمرؓ کے اس اقرار پر کہ آپؐ انھیں ان کی ذات سے پیارے ہیں آپؐ نے فرمایا "ہاں اے عمر! اب تمھارا ایمان کامل ہوا۔"

المختصر آنحضور صلعم کی محبت ہی اللہ تعالےٰ سے تعلق قائم کراتی ہے۔

ہست دینِ مصطفےٰ دینِ حیات
شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات[1]

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ دینِ مصطفےٰ صلعم ہی دینِ حیات ہے۔ اللہ تعالےٰ حکیم مطلق اور خالق کون و مکاں ہے۔ اسی کی قدرت سے انسان کا خمیر تیار ہوا اور اسی ذاتِ ستودہ صفات نے انسان کو زندگی عطا کر کے اسے دنیا میں اپنا خلیفہ مقرر فرمایا۔ خالق ہی اپنی تخلیق کے مزاج سے کماحقہ' واقف ہوتا ہے۔ لہذا دینِ اسلام ہی دینِ فطرت ہے۔ یہی وہ دین تھا جس پر حضرت آدم، حضرت شیث، حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ حضرت اسمٰعیل، حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام تھے اور انھوں نے اس کی تبلیغ و ترویج میں اپنی مقدس زندگیاں صرف کیں۔ یہی وہ دینِ حق ہے جس کے لیے آنحضرت صلعم نے مصیبتیں برداشت کیں۔ یہی دین انسانیت، یہی دینِ فطرت یہی دینِ حق اور یہی دینِ اسلام ہے۔ اس دین کی شریعت اصول و ضوابطِ حیات کی جامع و مانع تفسیر ہے۔ آنحضور صلعم نے اسلام کو اپنی زندگی پر جاری کر کے اسے قابلِ عمل ثابت کیا۔ لہذا آپ کی سنت پر عمل ہی اعلیٰ زندگی بسر کرنے کی ضمانت ہے۔

---

[1] اسرار و رموز ص ۱۴۸ (در معنی ایں کہ پختگی سیرتِ ملیہ از اتباعِ آئینِ الٰہیہ است)

از پیامِ مصطفےٰ آگاہ شو
فارغ از ارباب دوں اللہ شو[1]

ڈاکٹر اقبال مسلمان کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ آنحضور صلعم کے پیغام "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" پر ایمان لائے۔ یعنی یہ کہ سوائے اللہ کے کسی کو اپنا معبود نہ ٹھیرائے۔ اسے یہ بھی چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ کو ہی کارساز جانے اور کسی کو بھی اس کا شریک نہ کرے۔ اگر انسان اپنے نفس کے اشاروں پر چلے تو وہ اپنے نفس کا پرستار ہوا۔ اگر اس نے بتوں، درختوں، جانوروں، مظاہر قدرت یعنی سورج، چاند، ستاروں اور جنوں وغیرہ کو کارساز جانا تب وہ اُن کا پرستار ہوکر ملحد ہوا۔ درحقیقت مسلمان وہی ہے جو اللہ تعالےٰ کو اپنا حاجت روا جان کر اسی کی عبادت کرے اور سوائے اس کے ہر دوسری طاقت سے رشتہ توڑ ڈالے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ ہرگز مسلمان نہیں بلکہ کافر یا مشرک ہے۔

اللہ تبارک وتعالےٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ

کہ اے محمد! وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس کی

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ

کوئی اولاد ہے اور نہ ہی وہ کسی کی اولاد ہے اور اس کی

---

[1] اسرار و رموز صفحہ ۱۸۸ (اللہ الصمد) در تفسیر سورۂ اخلاص

برابری کا کوئی نہیں ہے۔

المختصر آنحضور صلعم کا پیغام ہے کہ اللہ ایک ہے، وہ بے نیاز ہے اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ لہٰذا مسلمان کو چاہیے کہ اللہ تعالےٰ ہی کی عبادت کرے، اسی سے مدد چاہے اور اس کا شریک کسی دوسری طاقت کو نہ کرے۔ بس یہی صراطِ مستقیم ہے کہ غیر اللہ سے تعلق ہی قائم نہ کیا جائے۔

ہر کہ عشقِ مصطفےٰ سامانِ اوست

بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست ؎

علامہؒ فرماتے ہیں کہ ہر وہ شخص کہ جس کے دل کا سرمایہ آنحضور صلعم کا عشق ہے، بلاشبہ وہ دنیا پہ متصرف ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اللہ تعالےٰ کی اطاعت، آپؐ سے وفا اللہ تعالےٰ سے وفا، آپؐ سے دوستی اللہ تعالےٰ سے دوستی اور آپؐ سے عشق اللہ تعالےٰ سے عشق قرار دیا گیا ہے۔ صوفیا بھی فنا فی الرسول سے فنا فی اللہ کی طرف صعود کرتے ہیں۔ جو شخص خواہشاتِ نفسانی پہ فتح پا چکا ہو اور اپنی رضا اللہ تعالےٰ کی رضا کے سپرد کر دے، تو دنیا کی ہر چیز اس کی محکوم ہو جاتی ہے۔ اقبال چاہتے ہیں کہ سب مسلمان حقیقی معنوں میں آنحضور صلعم کے عاشقِ صادق بنیں اور اٹھتے

؎ پیامِ مشرق از اقبال ص۸

بیٹھتے، چلتے پھرتے آپ کی سنّت پر عمل پیرا ہوں تاکہ وہ اس دنیا میں بھی عزّت سے رہیں اور عقبیٰ میں بھی سرخرو ہوں۔

(۲)

زانکہ ملّت را حیات از عشقِ اوست
برگ و سازِ کائنات از عشقِ اوست [۱]

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اُمّتِ مسلمہ کی زندگی آنحضرت صلعم کے عشق ہی سے کامیاب ہے۔ اگر اُمّت کے افراد ان کے عشق سے بے بہرہ ہو جائیں تو ان کا شمار زندہ لاشوں میں ہی ہو سکتا ہے۔ فی زمانہ ہم نے عشقِ رسول کو ترک کر رکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم دنیا میں ذلیل و خوار ہیں۔ اگر ہم آنحضرت صلعم کی محبت کو دل میں جاگزیں کر لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم دنیا میں حسبِ سابق معزز و موقر نہ ہوں۔ کائنات میں رونق کا سبب آنحضور صلعم کا عشق ہی ہے۔ اگر کائنات سے آپ کا عشق معدوم ہو جائے تو وہ خالی اور بے مقصد رہ جائے گی۔

(۳)

تب و تابِ بتکدۂ عجم نرسد بسوز و گدازِ من
کہ بیک نگاہِ محمدِ عربی گرفت حجازِ من [۲]

علامہ فرماتے ہیں کہ عجم (بیرونِ عرب) کے بتکدوں کی شان و شوکت

---

[۱] پیامِ مشرق ص۳ [۲] پیامِ مشرق ص۲۴۵

اس قابل نہیں ہے کہ ان کے دل کو قبضے میں لائے اور سوز و گداز کا سبب بن سکے۔ یہ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شرابِ معرفت سے چھلکتی ہوئی مست آنکھوں کی اک نظر نے ان کے حجازِ دل کو فتح کر لیا ہے۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ اقبال ظاہری چمک دمک سے متاثر نہیں ہوتے۔ وہ تو جوہرِ خالص کے خواہاں ہیں۔ انھیں دل کی قیمت آنحضور صلعم کی نظرِ کرم سے ملی۔ لہٰذا دل دے بیٹھے اور آپ کی محبت کو اپنے دل کا سرمایہ قرار دے کر اپنے آپ کو ان کے قدموں میں ڈال دیا۔

---

(۱)

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا

اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا [۱]

سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاندانِ بنو ہاشم کے چشم و چراغ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو چالیس سال کی عمر میں اُمّ القریٰ یعنی مکہ میں عہدۂ نبوت پر سرفراز فرمایا۔ مکہ ملک حجاز کا ایک شہر ہے۔ آپ کی تبلیغ سے سب سے پہلے حجاز والے ہی اسلام کے فیض سے مستفیض ہوئے۔ اقبال کو آنحضور صلعم سے والہانہ محبت ہے۔ ان کے نزدیک آپ کی محبت ہر مسلمان کے دل میں جاگزیں ہے۔ آپ سید البشر ہونے

---

[۱] بانگِ درا از اقبال ص ۱۷۳

ہوئے خیر الاُمم اُمتِ وسطیٰ کے رہنما بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ آنحضور صلعم کے سالارِ قافلۂ اُمّت ہونے پر فخر کرتے ہیں اور ان کے اسمِ گرامی کو تمام مسلمانوں کے دلوں کے لیے سرمایۂ سکون قرار دیتے ہیں۔

(۲)

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں [۱]

ارشادِ باری تعالےٰ ہے کہ جس نے آنحضور صلعم کی اطاعت کی بیشک اس نے اللہ تعالےٰ کی اطاعت کی۔ چنانچہ ڈاکٹر اقبال مسلمان سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے مسلمان! اگر تو آنحضرت صلعم سے کیے ہوئے عہد پہ قائم رہا اور اللہ تعالےٰ کی توحید پہ صدقِ دل سے ایمان لاکر اپنے عمل سے اس کی تصدیق کی تو جان لے کہ اللہ تعالےٰ تیرے ساتھ ہے اور جب اللہ تعالےٰ ساتھ ہوا تو یہ کائنات کیا بلکہ لوح و قلم بھی تیرے اختیار میں ہو جائیں گے۔ اقبال نے جبھی تو ایک مقام پہ کہا ہے ؏

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

سعدی شیرازی علیہ الرحمۃ نے اسی مضمون کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان فرمایا ہے ؎

---

[۱] بانگِ درا صفحہ ۲۳۲

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جو انسان اللہ کا ہو جائے، اللہ اس کا ہو جاتا ہے اور جس کا اللہ ہو جائے تو بلاشبہ تمام کائنات اسی کی ہے۔

(۳)

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی [1]

علامہ اقبال نے یہاں ایک بہت بڑی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے حق و باطل کی جنگ چھڑی ہے جو آج تک جاری ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے ابلیس نے دشمنی کی، قابیل نے ہابیل علیہ السلام کو قتل کیا، نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا، فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ناروا سلوک کیا، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ابولہب اور ابوسفیان نے دشمنی رکھی اور انہیں تکلیفیں پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا، معاویہ نے حضرت علی علیہ السلام کے خلاف بغاوت کی اور یزید نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو میدانِ کربلا میں شہید کر ڈالا۔ غرضیکہ باطل ہمیشہ حق سے برسرِ پیکار رہتا ہے۔ اقبال نے ہی دوسری جگہ فرمایا ہے (۱) موسیٰ و فرعون و شبیرؑ و یزید۔ ایں دو قوت از حیات آمد پدید

---

[1] بانگِ درا صفحہ ۲۴۹

(۲۱) ستیزہ حق از قوتِ شبیری است ۔ باطل آخر داغِ حسرت میری است ۔
الحاصل نور سے نار ہمیشہ الجھی رہی اور حق و باطل میں کبھی صلح نہ ہوگی ۔

---

(۱)

وہ دانائے سُبل ختم الرّسُل مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا [۱]

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ آنحضور صلعم معرفتِ حق کے راستوں کے جاننے والے رسولوں کے سلسلے کے آخری رسول اور تمام بنی نوعِ انسان کے سردار ہیں ۔ آپ ہی وہ مقدس شخصیت ہیں جس نے عربوں جیسے اکھڑ، اجڈ، گمراہ اور پست اخلاق لوگوں کو انتہائی ہمدرد، بہترین مومن اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا حامل بنا دیا کہ وہ مستقبل میں معرفتِ حق کے سرچشمے قرار پائے ۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ آپ نے گمراہ کو رہنما بنا دیا اور اس طرح غبارِ راہ کو نورِ ہدایت میں بدل دیا، جس سے عام لوگوں نے فیض حاصل کیا ۔

(۲)

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہی طٰہٰ [۲]

اقبال عاشقِ رسول ہیں ۔ ان کی نظر میں آنحضور صلعم ہی اوّل ہیں یعنی

---

[۱] بالِ جبریل ص ۱۴۱ [۲] بالِ جبریل ص ۱۴۱

آپ کا نور ہی اللہ تعالےٰ نے سب سے پہلے خلق کیا۔ انھوں نے آپ کو آخر اس لیے کہا کہ یومِ آخر آپؐ ہی ہمارے شفیع ہوں گے۔ ہم عشق کے ماروں کے نزدیک آنحضور صلعم ہی ہماری ابتدا ہیں اور آپؐ ہی ہماری انتہا۔ یعنی عشق کی ابتدا آپ کی ذات ہی سے ہے اور اس کی انتہا بھی آپؐ ہی پر ہے۔ آپؐ کی مقدس ذات ہی قرآنِ ناطق ہے۔ قرآن کریم آپؐ ہی کی زبان پر رواں تھا، آپؐ ہی نے حق و باطل کا فرق ظاہر فرمایا اور آپؐ ہی کو اللہ تعالےٰ نے یٰسین اور طٰہٰ کے خطابات سے نوازا۔ غرضیکہ عاشقانِ رسول کے نزدیک ان کا سرمایۂ حیات آپؐ ہی کی ذاتِ ستودہ صفات ہے۔

(۳)

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام [۱]

علامہ اقبال عشق کو ہی باعثِ تکوینِ کائنات تصور کرتے ہیں۔ آپ صوفیا میں مشہور ایک حدیثِ قدسی کو بنیاد بنا کر کائنات کی آفرینش کی وجہ معرفتِ الٰہی قرار دیتے ہیں۔ حدیثِ قدسی ہے: "میں (اللہ) ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں۔ پس میں نے کائنات کو پیدا کیا"۔ درحقیقت انسان سوائے عشق کے اپنی زمام کسی کے حوالے نہیں کرتا۔ عشق ہی اسے خودسپردگی سکھاتا ہے۔ عشق ہی اسے اپنی رضا کو معشوق کی رضا کے سپرد

---

[۱] بالِ جبریل ص ۱۲۳

کرنے پیدا مادہ کرتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالٰے نے انسانوں اور جنوں کو عبادت کے لیے پیدا کیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں آیا ہے "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ" (سورہ ذاریات) یہی عبادت عشق کا ثمر ہے۔ چنانچہ اسی لیے عبادت کو مومنین کی معراج قرار دیا گیا ہے۔ پس یہ امر قرار پاگیا کہ اپنی رضا کو اللہ تعالٰے کی رضا کے حوالے کرنے اور معرفتِ الٰہی کے جتنے ذریعے ہیں ان سب کا دوسرا نام عشق ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم، تمام انبیا و رسل اور تمام الہامی کتابیں اسی عشقِ حقیقی کی مختلف صورتیں ہیں۔ لہٰذا یہی عشقِ حقیقی انسان کو فنا فی اللہ تک پہنچانے کا واحد ذریعہ ہے۔

(۴)

تازہ میرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفٰے! عقل تمام بولہب! [1]

علامہ فرماتے ہیں کہ ان کے ضمیر میں حق و باطل کی پرانی جنگ پھر شروع ہوگئی ہے۔ عشق نمائندۂ حق ہے اور عقل نمائندۂ باطل۔ عقل ہر قدم پہ کیوں اور کیسے کی قبیل کے اعتراضات کرتی ہے اور عشق بے چون وچرا تسلیم کرتا چلا جاتا ہے۔ آنحضور صلعم عشقِ مجسّم تھے۔ آپ ابتدا ہی سے دینِ ابراہیمی پر تھے۔ بعثتِ نبوت نے آپ کا تعلق اللہ سے اور بھی

---

[1] بال جبریل ص ۱۵۵

مستحکم و مستقل کر دیا۔ آپ نے اپنی مرضی اللہ تعالے کے سپرد کر دی اور یہاں تک اطاعت بجالائے کہ اللہ تبارک و تعالٰے نے فرمایا:

"وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى"

(محمد صلعم) نہیں کہتے اپنے نفس سے کچھ، مگر وہی جو ان کی طرف وحی کیا جاتا ہے

نیز پھر فرمایا:

"وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى" (سورۃ انفال)

(جو تو نے پھینکا تھا، وہ تو نہیں بلکہ اللہ نے پھینکا تھا)

یہ عشق ہی کا فیض تھا کہ جس کی بنا پر آنحضرت صلعم نے تبلیغ حق میں صعوبتیں برداشت کیں۔ ابولہب نے عقل کو رہنما بنایا۔ چنانچہ اس کے نزدیک کسی فرشتے کو رسول معبوث ہونا تھا۔ وہ اپنے جیسے انسان کی نبوت پر کیسے ایمان لاتا۔ اسی عقل کی رہبری نے اسے ڈبویا اور بارگاہِ حق میں ملعون ٹھیرایا۔ فرعون نے بھی عقل کو رہنما بنایا اور حضرت موسیٰ کو ایک عام انسان سمجھ کر ان کی نبوت سے منکر ہوا، چنانچہ اللہ تعالے کے نزدیک مردود ہوا۔ ابلیس نے عقل کی روشنی میں ہی حضرت آدم کو سجدہ تعظیمی نہ کرنے کا جواز "اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ" تلاش کیا۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ عقل کو رہبر بنانے والے باطل سے ہی متمسک رہنے پر مجبور ہیں جبکہ عشق کو رہنما بنانے والے حق کو پا لیتے ہیں۔

---

(۱)

بایں پیری رہِ یثرب گرفتم — نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام — کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ ۱؎

علامہ اقبالؒ کو زیارتِ حرمین شریفین کی خواہش زندگی بھر رہی، لیکن افسوس کہ وہ اسے پورا نہ کر سکے۔ تاہم اپنے خیالات کی دنیا میں وہ ہمیشہ اس نعمت سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ اس رباعی میں بھی اپنی اسی خواہش کی تکمیل کے لیے کمر ہمت باندھنے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انھوں نے عشقِ رسول صلعم میں مست ہو کر محبت کے نغمے الاپنے شروع کر دیے ہیں اور بڑھاپے میں مدینہ منورہ کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ وہ بڑھاپے میں اپنے مدینے جانے کو اس پرندے کی کوشش تلاش آشیانہ سے تشبیہ دیتے ہیں جو صحرا میں شام کے وقت اپنے مسکن کی فکر میں مائل پرواز ہوتا ہے۔ اقبال گنجینۂ خضرا کی موجودگی کی وجہ سے مدینے کو محفوظ و مصئون مامن سمجھتے ہیں اور وطنی قیود کو توڑ کر آخری عمر میں وہاں جانا چاہتے ہیں تاکہ پایانِ عمر میں ہی اپنے معشوق سے مستقل تمسک قائم کر کے نجاتِ اخروی اور شفاعت کا سامان فراہم کر سکیں۔

(۲)

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم — من و تو کشتۂ شانِ جمالیم
دو حرفے بر مرادِ دل بگوئیم — بپائے خواجہ چشماں را بمالیم ۲؎

۱؎ حجاز ص ۲۹ — ۲؎ ارمغان حجاز ص ۳۶

اقبال اپنے ہم نفس یعنی ساقی سے جو عشقِ رسول صلعم میں آپ کی طرح ہی سرمست ہے، فرماتے ہیں "اے ساقی! ہم دونوں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جمالِ جہاں آرا کے عاشق ہیں اور دونوں وصلِ معشوق کے لیے مضطرب ہیں۔ لہذا نزدیک آ، کہ ہم دونوں مل کر فراقِ رسولؐ میں آہ وزاری کریں، اور رو رو کر اللہ تعالیٰ سے یہ دو حرفی دعا کریں کہ ہمیں آنحضور صلعم کی زیارت نصیب ہو۔ تاکہ ہم اپنے آقا کے پائے مبارک سے آنکھیں ملنے کا شرف حاصل کریں، جس کے ہم ہمیشہ آرزومند رہے ہیں۔" کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

اس رباعی کی رو سے دونوں عاشق اپنے معشوق کے فراق میں نالہ کناں ہیں، اور باہم مل کر اس لیے رو رہے ہیں کہ دونوں عشق کے مارے مایوس و مجبور ہیں۔ یہاں دونوں عاشقوں میں اتحادِ مقصد یہاں تک ہے کہ دونوں کا معشوق بھی ایک ہی ذات ہے اور دونوں وصال کے خواہاں ہوتے ہوئے آرزوئے وصال کے اظہار کو ترکِ ادب سمجھتے ہیں۔ ان کی دو حرفی مراد تو زیارتِ معشوق ہے، تاکہ اس کے تلووں سے اپنی آنکھیں ملنے کی سعادت حاصل کریں۔

(۳)

بمنزل کوش مانندِ مہِ نو
دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو
مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفےٰ رو[۱]

علامہ اقبال مسلمان کے سامنے چاندرات کے باریک چاند کی مثال پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اسے بھی ہلال کی طرح روز بروز ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے کائنات میں رواں دواں رہنا چاہیئے۔ جیسے ہلال ترقی کر کے بدرِ کامل بن جاتا ہے اسی طرح اسے بھی بامِ عروج پر پہنچنا چاہیئے۔ اس دنیا میں مقصدِ زندگی اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب کہ انسان دل کو آنحضور صلعم کی پیروی میں راہِ ہدایت پر لے چلے۔ اللہ تبارک و تعالےٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (سورۂ نساء)

(ہم نے ہر ایک رسول کو اس لیے بھیجا کہ اس کی اطاعت ہمارے اذن سے کی جائے)

نیز فرمایا ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ (سورۂ نساء)

(جس نے اس رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی)

الغرض مسلمان کو چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ کو واحد جان کر صرف اسی سے دل لگائے اور آنحضور صلعم کی سنت پر چلے۔ اگر وہ شریعت پر بطریق چلے گا تو یقین جانیئے کہ ہلال کی طرح نورانی راستے میں ترقی کرتے ہوئے

---

[۱] ارمغانِ حجاز صہ ۸۹

منتہائے کمال پہ پہنچ کر اس دنیا میں بھی معزز و مؤقر رہے گا اور عقبیٰ میں بھی سرخروئی حاصل کرے گا۔

(۴)

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است [1]

سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب کہا ہے:

محال است سعدی کہ راہ صفا / تواں رفت جز در پئے مصطفیٰ
خلافِ پیمبر کسے راہ گزید / کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

اقبال بھی ان کے ہمنوا ہیں۔ چنانچہ ان کا کہنا بھی یہی ہے کہ مسلمان کو پوری طرح آنحضور صلعم کی پیروی کرنی چاہیئے جبھی وہ راہِ حق پہ گامزن رہ سکتا ہے۔ وگرنہ خواہ وہ کتنی ہی عبادت و ریاضت کیوں نہ کرے کبھی بھی فلاح نہ پا سکے گا، جیسے کہ بولہب آنحضرت صلعم کو چھوڑ کر آخر مردود ہی ٹھیرا۔ آنحضور صلعم کی اطاعت ہی حق ہے اور باقی سب کچھ باطل ہے۔ آنحضرت صلعم کی معرفت حاصل نہ کرنا بولہبی ہے۔ ابولہب نے آپ کی معرفت حاصل نہ کی اور راہِ حق کو چھوڑ کر باطل کا راستہ اختیار کر لیا۔ لہذا اگر ہم آپ کی پیروی نہ کریں گے تو کبھی فلاح نہ پا سکیں گے۔

---

[1] ارمغانِ حجاز ص ۲۷۸

(۱)

علم و حکمت کے مدینے کی کشش ہے مجھ کو
لطف دے جاتا ہے کیا کیا مجھے ناداں ہونا [۱]

آنحضور صلعم نے فرمایا ہے: "اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ" میں علم کا شہر ہوں اور اَنَا دَارُالْحِکْمَةِ" یعنی میں حکمت کا گھر ہوں۔ چنانچہ اقبالؔ فرماتے ہیں کہ انہیں علم و حکمت کے شہر یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کی کشش ہے اور اس محبت کی کشش میں وارفتگی انہیں بے حد لطف دیتی ہے۔ اس مادی دنیا میں مادہ پرست اشخاص کے نزدیک عشقِ رسول کا دعویٰ ادعائے پارینہ سے ہے اور عاشقِ رسول ہو کر مذہبی علوم و فنون کا اکتساب رجعت پسندی، قدامت پرستی اور نادانی سمجھا جاتا ہے۔ اقبال کا مطمع نظر مقصدِ حیات کا حصول ہے جو آنحضور صلعم کا دامن پکڑے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس سلسلے میں انہیں فرزندانِ تہذیبِ جدید کا عطا کردہ خطاب "ناداں" بڑا لطف دیتا ہے۔ محبتِ رسول میں مذہبی باتیں کرنے والے دنیا والوں کے نزدیک ناداں ہیں لیکن درحقیقت وہی لوگ خرد مند اور کامیاب ہیں۔

(۲)

زندگی تجھ سے ہے اے فخرِ براہیم اپنی
کردہ حق سے کہ مشکل ہوا جینا اپنا [۲]

---

[۱] باقیاتِ اقبال ص ۲۷ [۲] باقیاتِ اقبال ص ۳۹

علامہ رح آنحضور صلعم سے مخاطب ہو کر عرض پرداز ہیں "یا رسول اللہ! آپ کی اعلیٰ و ارفع ذات آپ کے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے بجا طور پہ باعثِ فخر ہے۔ اپنی رحمۃ اللعالمینی کا صدقہ ہماری زبوں حالی پہ رحم فرمائیے اور حق تعالےٰ سے دعا کیجیے کہ ہمیں ذلت سے نجات ملے تاکہ ہم اس دنیا میں عزت کی زندگی گزار سکیں"

اقبال مسلمانوں کی حرماں نصیبی کو دیکھ کر بے حد رنجیدہ ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ساری ملتِ اسلامیہ غیر اقوام سے مغلوب ہو چکی ہے۔ دنیا میں جہاں مسلمانوں کا ڈنکا بجتا تھا وہاں اب وہ مقہور، مجبور اور گمنام ہیں۔ دنیا کی سیاست میں اب ان کا کوئی مقام نہیں جبکہ چند سو سال پیشتر وہ دنیا کی سیاست کے محور تھے۔ چنانچہ اس شعر میں ڈاکٹر اقبال مستجاب الدعوات، رحمۃ للعالمین، خاتم المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کے طالب ہیں تاکہ آپ کی دعا بارگاہِ ایزدی میں مقبول ہو اور مسلمان اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ پالیں۔

(۵۱)

بزمِ عالم میں طرازِ مسندِ عظمت ہے تُو ۔۔۔ بہرِ انساں جبرئیلِ آیۂ رحمت ہے تو
اے دیارِ علم و حکمت قبلۂ امت ہے تو ۔۔۔ اے ضیائے چشمِ ایماں زیبِ ہر مدحت ہے تو

دردِ جو انساں کا تھا وہ تیرے پہلو سے اٹھا
قلزمِ جوشِ محبت تیرے آنسو سے اٹھا [1]

---

[1] باقیات ۱۵۱

علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ فرماتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اس دنیا کی محفل میں انسان کے لیے اللہ تعالٰے کی رحمت کے لانے والے ہیں۔ آپ ہی نے اسے بندگی کے تخت پر بٹھایا۔ وہ لوگ جو آپ پر ایمان لائے اس دنیا میں مُوقر، معزّز اور بلند مرتبہ قرار پائے۔ آپ علم و حکمت کا گھر ہیں اور ملّتِ اسلامیہ کو آپ ہی نے راہِ مستقیم دکھائی اور اس پہ گامزن کیا۔ آپ کی ذاتِ ستودہ صفات سے محبت چشمِ ایمان کو روشنی عطا فرماتی ہے۔ چونکہ آپ رحمۃٌ للعالمین بھی ہیں لہٰذا ہر تعریف آپ ہی کو سزاوار ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپ کو بنی نوعِ انسان سے بے حد محبت تھی۔ آپؐ نے فتحِ مکّہ کے دن اپنے دشمنوں کو "لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْم" کہہ کر معاف کر دیا۔ آپؐ نے عبداللہ بن ابی تک کے جنازے کی نماز پڑھی۔ آپ راتوں کو سجدے میں "یَا رَبِّ اُمَّتِیْ یَا رَبِّ اُمَّتِیْ" کہہ کہہ کر گنہگارِ امّت کے لیے اشک فشانی فرمایا کرتے تھے۔ آپ ہی کی بدولت انسان کو دنیا و عقبیٰ کی فلاح نصیب ہوئی۔

اقبال محبِّ علی علیہ السّلام

یہ ہے اقبالؔ فیضِ یادِ نامِ مرتضیٰؓ جس سے
نگاہِ فکر میں خلوت سرائے لامکاں تک ہے

(اقبالؔ)

علامہ اقبالؔ نے ابتدائی تربیت ہی اسلامی ماحول میں پائی۔ آپ کے والدگرامی مکارمِ اخلاق، دینداری اور زہد و اتقا سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ وہ صابر و شاکر مسلمان تھے اور علماء و صلحا کی ہم نشینی کے شائق تھے۔ آپ نے عربی و فارسی حضرت مولوی میر حسن صاحب سے پڑھی، جنھوں نے زبانوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ کو دین کی طرف بھی مائل کیا۔ چنانچہ ابتدائی دینی تعلیم انہی سے حاصل کی۔ اسلامیات میں باقاعدہ مطالعہ آپ نے اپنے مقالے ایران میں فلسفہ مابعد الطبیعیات کا ارتقا" کی تیاری کے لیے کیا اس سلسلے میں جہاں آپ نے قرآن کریم کی تفاسیر کو نظر سے گزارا وہاں احادیثِ نبوی، تصانیفِ صوفیا اور اسلامی تاریخ کا بھی بغور مطالعہ کیا۔ چنانچہ قرآن، حدیث، صوفیا کے اقوال اور اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے آپ اس نتیجے پہ پہنچے کہ وہ مرتضیٰ شخصیت جس نے آنحضور صلعم کی ہر قدم پہ نصرت کی، ان کی حفاظت میں اپنی جان

ہتھیلی پر رکھے رہے اور دینِ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ہمیشہ جان کی بازی لگاتے رہے حضرت علی علیہ السّلام ہی ہیں ۔ حضرت اقبال عاشقِ رسول تھے لہذا انہیں ہر اس شخص سے محبت تھی جس نے آنحضور صلعم کی نصرت اور پیروی کی ۔ احادیث اور اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے آپ پر یہ حقیقت اظہرمن الشمس ہوئی کہ حضرت علی علیہ السّلام نصرتِ رسولؐ، متابعتِ پیغمبرؐ اور اسلامی خدمات کے اعتبار سے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم پر بدرجہ کمال فوقیت و برتری رکھتے ہیں۔ اگر میں شیعہ کا لفظ لغوی معنوں میں استعمال کروں تو مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ علاّمہ اقبال مخلص شیعانِ علیؑ سے ہیں ۔ آپ کو جہاں آنحضور صلعم سے عشق تھا وہاں حضرت علی علیہ السّلام سے بھی والہانہ محبت تھی ۔ آپ نے مدح دیگر صحابہ کرام کی بھی کی ہے تاہم اس کلام میں وہ وارفتگی نہیں جو حضرت علی علیہ السّلام کی منقبت کے سلسلے میں پاتے ہیں ۔ حضرت علی علیہ السّلام کی محبت کے اظہار بیان میں تو وہ یہاں تک سرمست و بے خود ہوتے ہیں کہ مدح کی آخری حدوں کو بھی پھاند جاتے ہیں ۔ آپ ان کی منقبت کو نعتِ رسول اور نعتِ رسول کو ان کی منقبت قرار دیتے ہیں ۔ طوالت سے گریز کرتے ہوئے اب میں اقبال کے اس کلام کی تشریحات شروع کرتا ہوں جو انھوں نے حضرت علی علیہ السّلام کی منقبت میں فرمایا ہے ۔

(۱)

مُسلمِ اوّل شہِ مرداں علیؓ
عشق را سرمایۂ ایماں علیؓ

علامہ اقبال حضرت علی علیہ السّلام کی شان میں اس شعر کے علاوہ اگر کچھ بھی نہ کہتے تب بھی بلاشبہ مدحتِ علیؑ کا تاج سر پہ رکھ چکے ہوتے اور قیامت میں آنحضور صلعم کی شفاعت کے حق دار ہو جاتے۔ ایسے ہی اشعار تو "دریا در کوزہ" یا "دریا بہ حباب اندر" کے مصداق ہوا کرتے ہیں۔

یہاں اقبال نے حضرت علی علیہ السّلام کی تین نمایاں خصوصیات بیان فرمائی ہیں۔ سب سے پہلی یہ کہ وہ مسلم اوّل ہیں، دوسری یہ کہ وہ شہِ مرداں ہیں اور تیسری یہ کہ وہ عشقِ حقیقی کے لیے ایمان کا سرمایہ ہیں۔ آیئے ہم اسلامی تاریخ و احادیثِ نبوی کی روشنی میں ان خصوصیات کا جائزہ لیں۔

جہاں تک آپ کے مسلم اوّل ہونے کا تعلق ہے تاریخ طبری میں حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی گئی ہے کہ انھوں نے فرمایا:
"اوّل من صلّی علیؑ" یعنی سب سے پہلے حضرت علیؑ نے نماز پڑھی۔ اسی تاریخ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے "قال بعث رسول اللہ یوم الاثنین وصلّی علی یوم الثلاثہ" یعنی رسول اللہ پیر کے دن مبعوث ہوئے اور علی نے منگل کے دن نماز پڑھی تھی۔ زید بن ارقم رضؓ سے مروی ہے "اوّل من اسلم مع رسول اللہ علی بن ابی طالب" یعنی جو رسول اللہ پہ سب سے پہلے ایمان لائے وہ حضرت علی المرتضیٰ تھے۔ ابو حازم اور الکلبی کا قول ہے "علی اوّل من اسلم" یعنی علی سب سے پہلے اسلام لائے۔ محدث مجاہد بھی اسی خیال کے تھے کہ علیؑ سب سے پہلے ایمان لائے۔ المسعودی میں مرقوم ہے کہ لوگوں نے علی بن ابی طالب کے اسلام

لانے کے باب میں اختلاف کیا ہے۔ اکثر لوگوں کا مسلک یہ ہے کہ انھوں نے کبھی شرک نہیں کیا۔ وہ اسلام کے سوا کسی دوسرے مسلک سے آشنا ہی نہیں ہوئے۔ وہ رسول اللہ کے ہر فعل و عمل کے تابع تھے اور اسی پر وہ بالغ ہوئے۔ ابن ہشام، ابن اسحٰق اور ابن کثیر نے اس باب میں عفیف کی ایک روایت اخراج کی ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جب ابوطالب پر حضرت علی کے ایمان لانے کا راز کھل گیا تب بھی رسول اللہ، جناب علیؑ اور سیدہ خدیجہؑ کے ساتھ خانۂ کعبہ میں آتے اور وہاں یہ تینوں مل کر نماز پڑھتے اور کبھی کبھی کیا اکثر قریش اور باہر سے آنے والوں کی نگاہیں ان پر اٹھ جاتیں۔ عفیف کی اس روایت سے اس بات کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ جب اس نے ان تینوں کو یکجا دیکھا تو جناب عباسؓ نے اس سے تینوں کا تعارف کرایا تھا اور کہا تھا "بخدا مجھے روئے زمین پر ان تینوں کے سوائے کسی ایسے شخص کا علم نہیں ہے جو اس دین کا ماننے والا ہو۔" ابن اسحٰق کی ایک روایت کی رو سے رسول اللہ صلعم جب اعتکاف کی مدت پوری کرنے کے بعد مکہ لوٹ آئے اور پھر کبھی کبھی یا شاید روزانہ علی کو ساتھ لے کر مکے کی گھاٹیوں میں نکل جاتے، اور وہاں دونوں ایک ساتھ مل کر خدا کی عبادت کرتے اور اس کی نماز پڑھتے۔ محمد صلعم امامت فرماتے اور علیؑ ان کا اتباع کرتے۔ غرضیکہ آنحضور صلعم پر ایمان لانے والے اور آپؐ کے ہمراہ نماز قائم کرنے والے اولاً مکے کی گھاٹیوں میں، اور بعدہٗ خانۂ کعبہ میں حضرت علی علیہ السلام ہی ہیں۔ شعاب مکہ میں جو نمازیں ادا ہوتی رہیں ان میں آنحضور صلعم کے مقتدی صرف حضرت علیؑ

ہی دکھائی دیتے ہیں جب کہ اس کے بعد کی کعبہ میں پڑھی گئی نمازوں میں حضرت خدیجہؓ کا ان کے ساتھ اضافہ نظر آتا ہے۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اسلامی تاریخ کے دقیق مطالعے سے ہی اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ سب سے پہلے مسلمان حضرت علی علیہ السلام ہی ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے حضرت علی علیہ السلام کی دوسری خصوصیت "شیرِ مرداں" متعین کی ہے۔ اگر ہم تاریخِ اسلام کا مطالعہ کریں تو بلاشبہ ہر غزوے میں آپ کی امتیازی خدمات پائیں گے۔ آپ نے بدر، احد، خندق، خیبر غرضیکہ ہر معرکہ میں ذوالفقار کے جوہر دکھائے اور غزوۂ احد میں بروایت ابورافع رضی اللہ عنہ، جب آپ نے مشرکین کے علمبرداروں کو قتل کر دیا تو رسول اللہ صلعم کی نظر مشرکین کی ایک جماعت پر پڑی۔ آپ نے علیؑ سے کہا "ان پہ حملہ کرو۔" انھوں نے حملہ کر کے اس جماعت کو منتشر کر دیا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا: "یہ ہے ہمدردی" آپ نے فرمایا "بے شک! علی مجھ سے ہے اور میں علی سے ہوں" اور جبرئیل علیہ السلام نے کہا: "میں آپ دونوں کے ساتھ تیسرا ہوں" نیز صحابہؓ نے یہ آواز سنی "لَا فَتیٰ اِلَّا عَلِیٌّ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار"[۱] آپ نے غزوۂ خندق میں عمر بن عبدوُد اور غزوۂ خیبر میں مرحب جیسے جری پہلوانوں اور ممتاز بہادروں کو آنِ واحد میں خاک و خون میں تڑپا دیا اور دینِ اسلام کی لاج رکھ لی۔ غرضیکہ تمام مورخین کا اتفاق ہے

---

[۱] ترجمہ طبری اردو جلد اول حصہ سوم ص۲۵۳ اور سیرۃ ابنِ ہشام ص۱۰۶۹

کہ آپ تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے زیادہ بہادر و شجاع تھے۔ آپ اس اعلیٰ خصوصیت و فضیلت میں بے مثل، لاثانی اور بے بدل تھے۔

اقبال کے نزدیک، آپ کی تیسری امتیازی خصوصیت آپ کا عشقِ حقیقی کے لیے سرمایۂ ایمان ہونا ہے۔ تاریخ اسلام اس امر پہ شاہد عادل ہے کہ جب آنحضور صلعم نے دعوتِ ذوالعشیرہ میں کارِ تبلیغِ دین میں نصرت کی درخواست کی تو وہ واحد شخصیت جس نے اعلانِ نصرتِ حق کرتے ہوئے کہا "یارسول اللہ! گو کہ میری ٹانگیں پتلی ہیں، میری عمر کم ہے اور میں آشوبِ چشم کا مریض ہوں تاہم میں آپ کی مدد کے لیے حاضر ہوں"۔ حضرت علیؑ ہی تھے۔ خدا شاہد ہے کہ آپ نے عشقِ رسول میں کیے گئے وعدے کو پورا کرنے کے سلسلے میں اپنی جان ہمیشہ ہتھیلی پر رکھے رکھی۔ درحقیقت سرمایۂ ایمانِ عشق آپ کی ذات ہی تھی، جس نے آنحضور صلعم کی ہجرتِ مدینہ کے روز اُن کے بستر پہ استراحت کر کے راہِ عشقِ رسولؐ میں اپنی جان پیش کی اور نفس کے بدلے رضائے معشوقِ حقیقی خرید کرتے ہوئے عاشقِ رسولؐ و خدا ہونے کا عملی ثبوت فراہم کیا۔

---

(۲)

از ولائے دودمانش زندہ ام
در جہاں مثلِ گہر تابندہ ام

اقبال کو حضرت علی علیہ السّلام سے بے حد محبت ہے، جس کی بنیاد خاندانی فضیلت نہیں بلکہ تبحرِ علمی، شجاعت، عدالت، اطاعتِ رسول اور عشقِ معشوقِ حقیقی

میں امتیازی خصوصیات کے حامل ہونے پر ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کے فضیلت مآب خاندان کی محبت کے فیض سے ہی حقیقی اور روحانی زندگی برقرار رکھے ہوئے ہیں اور چار دانگِ عالم میں ان کی مقبولیت اور شہرت کی بنیاد بھی اسی متبرک رشتے کے باعث قائم ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک روح و جسم کے تعلق کا نام ہی زندگی نہیں ہے، بلکہ ان کی اس سے مراد رعنائے معشوقِ حقیقی کا حصول ہے جو بدون محبت اہلِ بیت اطہار ناممکن ہے۔

---

(۴۳)

نرگسم وارفتۂ نظارہ ام

در خیابانش چو بو آوارہ ام

علامہ فرماتے ہیں " میں حضرت علی علیہ السلام کے جمالِ جہاں آرا کے نظارے سے مبہوت، حیران، سرمست اور مدہوش ہو کر نرگس کی طرح سے سراپا چشم بن گیا ہوں۔ میری نگاہیں معشوق کی رعنائی سے مستقل تعلق رکھنے کے لیے مجبور ہیں۔ میں ان کے پروان چڑھائے ہوئے خیابانِ علم و حکمت میں خوشبو کی طرح سے آوارہ رہ کر اپنی حیات کو تقویت دے رہا ہوں" اقبال، حضرت علی علیہ السلام کے ارفع و اعلیٰ علمی مرتبے پر حیران ہیں اور علم و حکمت کی خوشہ چینی آپ ہی کے زریں اقوال اور کلام بلاغت نظام سے کرتے رہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ نے علم و حکمت کا فیض بابِ مدینۂ علم اور درِ دار الحکمت سے ہی پایا ہے۔

(۴)

زمزم ار جوشد ز خاکِ من ازوست

مے اگر ریزد ز تاکِ من ازوست

علامہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ شریعت کے دقیق مسائل بیان کریں تو یہ حضرت علی علیہ السلام کا ہی فیض ہوگا اور اگر تصوّف و طریقت کے نقطے بیان کریں تو وہ بھی اسی سرچشمۂ حقیقت سے اکتساب کردہ ہوں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ اقبال آپ کو علم و حکمت اور عشق و جذب کا منبع قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اسی لیے تمام ظاہری و باطنی علوم کا فیض آپ کی ذات سے ہی جاری سمجھتے ہیں۔ بھلا وہ کیوں ایسا نہ سمجھتے جب کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ "میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں" لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ تشنگانِ علم و حکمت کو حصولِ علومِ ظاہری و باطنی کے لیے حضرت علی علیہ السلام سے ہی تعلق وابستہ کرنا چاہیئے۔

---

(۵)

خاکم از مہرِ او آئینہ ام

می تواں دیدن نوا در سینہ ام

ڈاکٹر صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ وہ خاک کے پتلے ہیں لیکن حضرت علی علیہ السلام کی محبت کے اثر سے آئینہ بن گئے ہیں۔ لہٰذا عشق میں ان کے دل کا سوز و گداز جو اندرونِ سینہ انہیں بے تاب کیے ہوئے ہے باہر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ان کا دل عشقِ ماسوا اور خواہشاتِ نفسانی

کے لوٹ سے تاریک ہو چکا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام کی محبت نے ان کے دل کو آلائشوں سے پاک کر دیا اور صفائی قلب دے کر آئینہ بنا دیا جس میں انوار الٰہی عکس ریز ہونے لگے ہیں۔ لہٰذا اہلِ دانش و بینش ان کے دل کی صفائی کا اندازہ ان کے درد بھرے کلام سے ہی کر لیتے ہیں اور جان لیتے ہیں کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کی محبت کے ذریعہ منزلِ عشقِ رسول سے ہوتے ہوئے معشوقِ حقیقی تک پہنچ چکے ہیں۔

(۶)

از رُخِ او فالِ پیغمبر گرفت
ملتِ حق از شکوہش فر گرفت

حضرت علی علیہ السلام اطاعت و نصرتِ رسول اور اسلامی خدمات کی بنا پر اللہ تعالےٰ کے نزدیک بڑے برگزیدہ تھے۔ آنحضور صلعم نے حجۃ الوداع سے مراجعت کے وقت غدیرِ خم پہ آپ کو جمیع مومنین کا آقا قرار دیا۔ آپ نے اثباتِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے اپنی جان تک کی بازی لگانے سے کبھی دریغ نہ کیا۔ یہی وجہ تھی کہ غزوۂ خندق میں عمر بن عبدوُد کے خلاف آپ کی ایک ضرب کو تمام لوگوں کی عبادت و ریاضت سے افضل قرار دیا گیا۔ آنحضور نے آپ کو "ایمانِ کل" فرمایا۔ آنحضرت آپ پر ہمیشہ شفقت کی نظر رکھا کرتے اور تمام مسلمانوں کو بتا چکے تھے کہ "علیؑ کے چہرے کی طرف دیکھنا عبادت میں داخل ہے"۔ جب آپ پیدا ہوئے تو آنحضور صلعم نے سب سے پہلے گود میں لیا اور آپ کی پیاری شکل و صورت کو دیکھ کر آپ کے علوئے مرتبہ کو پا گئے۔

چنانچہ نام بھی علی یعنی بلند رکھا۔ آنحضور صلعم نے آپ کے رُخِ روشن میں اثباتِ دینِ حق کے آثار پائے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کو بچپن سے ہی اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ تاریخِ اسلام شاہد ہے کہ آپ نے رسولِ مقبول صلعم کی توقعات کو پورا کیا۔ تمام غزوات آپ کی شمشیرِ خاراشگاف کی بدولت فتوحات اور شکوہِ دینِ اسلام کا سبب بنے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی قوتِ بازو سے ہی دینِ حق کی بنیاد مستحکم ہوئی جس کی بنا پر اسے شان و شوکت نصیب ہوئی اور وہ چاردانگِ عالم میں پھیل گیا۔

(۷)

قوتِ دینِ مبیں فرمودہ اش
کائنات آئیں پذیر از دودہ اش

حضرت علی علیہ السلام کو "لا فتیٰ الا علی" کہہ کر دینِ اسلام کی قوت قرار دیا گیا ہے۔ آپ نے اپنی ذوالفقارِ خاراشگاف سے باطل کو کاٹ ڈالا۔ ابطالِ ادیانِ باطل کے ساتھ دینِ حق کا ارتقا شروع ہوا جس نے کائنات کی تہذیب و تزئین کی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ اسد اللہ الغالب حضرت علی علیہ السلام کو دینِ حق کی قوت قرار دیتے ہوئے ان کے خاندان کو دنیا کو سنوارنے والا تسلیم کرتے ہیں۔ سچ ہے اہلِ بیتِ اطہارؑ نے ہی شجرِ اسلام کو اپنے خون سے سینچا ہے اور کائنات میں فروغِ حق کا باعث ہوئے ہیں۔

(۸)

مُرسلِ حق کرد نامش بو تراب
حق یداللہ خواند در اُمّ الکتاب

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو پیار سے بو تراب کہا اور اللہ تبارک و تعالےٰ نے قرآنِ کریم میں آپ کو یداللہ فرمایا۔

بخاری شریف میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت نقل ہے کہ رسول اللہ صلعم حضرت فاطمہؓ کے گھر میں تشریف لائے تو حضرت علیؑ کو گھر میں نہ پاکر ان سے دریافت فرمایا۔ انھوں نے عرض کی "میرے اور ان کے مابین کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہ ناراض ہو کر چلے گئے اور میرے ہاں نہیں سوئے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے فرمایا۔ " دیکھو تو وہ کہاں ہیں؟" وہ دیکھ کر آیا۔ عرض کی "یا رسول اللہ صلعم! وہ مسجد میں سو رہے ہیں"۔ پس رسولِ خدا صلعم مسجد میں تشریف لے گئے۔ علیؑ لیٹے ہوئے تھے اور ان کی چادر پہلو سے گری ہوئی تھی اور انھیں مٹی لگ گئی تھی۔ رسولِ خدا صلعم ان کے جسم سے مٹی جھاڑتے تھے اور فرماتے تھے " ابو تراب اٹھو! ابو تراب اٹھو!"۔ "ابو تراب" کے لغوی معنی "مٹی کا باپ" ہیں۔ اقبال کے نزدیک ابو تراب اسے ہی کہا جا سکتا ہے جو کہ خواہشاتِ سفلی، کہ جسمِ خاکی کا خاصّہ ہیں، کے ترک کرنے پہ قادر ہو۔ درحقیقت حضرت علی علیہ السّلام خواہشاتِ نفسانی سے یہاں تک پاک تھے کہ آپ نے ایک زیب کیے ہوئے پہلوان کو

فوراً چھوڑ دیا جب کہ اس نے آپ کے چہرۂ مبارک پر تھوکا۔ آپ نہیں چاہتے تھے کہ انتقامی جذبہ کارِ فی سبیل اللہ میں شریک ہو۔

قرآنِ کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ؕ

تحقیق وہ لوگ کہ بیعت کرتے ہیں تجھ سے، سوائے اس کے نہیں

یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ"

کہ بیعت کرتے ہیں اللہ سے۔ ہاتھ اللہ کا ہے اوپر ہاتھ ان کے

(سورہ الفتح پارہ ۲۶)

اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ اس لیے قرار دیا کہ آپ نے اپنی رضا رضائے الٰہی کے سپرد کر دی تھی۔ اقبال نے آنحضور صلعم کے دستِ مبارک کو حضرت علیؑ کا ہاتھ اس لیے قرار دیا کہ انھوں نے اپنی رضا کو آنحضور صلعم کی رضا کے سپرد کر دیا تھا۔ لہٰذا آپ نے حضرت علیؑ کو مجازی طور پر یداللہ کے لقب سے ملقب کیا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ حضرت علی علیہ السّلام فنا فی الرّسول ہونے کے سبب یداللہ قرار پائے ہیں۔

(۹)

ہر کہ دانائے رموزِ زندگیست
سرِّ اسمائے علیؑ داند کہ چیست

اقبال فرماتے ہیں کہ وہ عقلمند جو زندگی کے بھید جانتا ہے وہی جان

سکتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے ناموں کے بعید کیا ہیں۔ علامہ کے نزدیک حضرت علیؑ کی حیاتِ طیبہ کامل و اکمل ہے اور ہمارے لیے نمونہ ہے۔ لہذا آپ کی شان کو وہی سمجھ سکتا ہے جو اسرارِ حیات سے آگاہ ہو۔ عام شخص آپ کے مقام سے ناواقف اور آپ کی معرفت سے نابلد ہے۔

(۱۰ تا ۱۳)

خاکِ تاریکے کہ نامِ او تن است | عقل از بیدادِ او در شیون است
فکرِ گردوں رس زمیں پیما ازو | چشم کور و گوش ناشنوا ازو
از ہوس تیغِ دو رُو دارد بدست | رہرواں را دل بریں رہزن شکست
شیرِ حق ایں خاک را تسخیر کرد | ایں گِلِ تاریک را اکسیر کرد

خاک اسفل و تاریک ہے۔ روح کے ارتباط سے خاکی جسد متحرک ہو جاتا ہے۔ جسم کے تقاضے یعنی خواہشاتِ نفسانی اگر روح پہ غالب آجائیں تو وہ اپنی لطافت اور نور کھو بیٹھتی ہے جس کی وجہ سے انسان کے خیالات پست ہو جاتے ہیں اور بلندی کی طرف صعود نہیں کرتے۔ روح کے مغلوب ہونے کا اثر قوتِ باصرہ و سامعہ پہ بھی بُرا پڑتا ہے اور انسان حق کے دیکھنے اور سننے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہ لالچ کا بندہ بن جاتا ہے جس سے زندگی کے راستے میں لٹا ہوا مسافر قرار پاتا ہے۔ لہذا اگر روح خاکی جسم پہ غلبہ و قدرت رکھے تو انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ مقصدِ حیات کو سمجھ کر اس کے حاصل کرنے کے لیے کامیاب تگ و دو کر سکے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ علی علیہ السلام نے اپنے جسمِ خاکی پہ غلبہ پا لیا تھا۔ چنانچہ

یہی وجہ تھی کہ آپ نے مقصدِ حیات کے بھید سے واقف ہو کر رضائے الٰہی کے حصول کے لیے جدوجہد کی اور آخرکار کامران اور بامراد ہوئے۔

(۱۴)

مرتضٰی کز تیغ او حق روشن است
بوتراب از فتحِ اقلیم تن است

حضرت علی علیہ السّلام اس لیے برگزیدہ، ارفع و اعلیٰ ہیں کہ ان کی شمشیرِ آہن گداز سے دینِ اسلام کو استحکام اور ترقی نصیب ہوئی۔ آپ کو بوتراب کا خطاب اس لیے عطا ہوا ہے کہ آپ نے مملکتِ تن کو فتح کر لیا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپ نے معرکۂ خندق و خیبر میں عمر بن عبدِ وُدّ اور مرحب کو واصلِ جہنم کر کے مسلمانوں کی لاج رکھ لی۔ احد کے دن آپ نے مشرکین کے آٹھ علمبرداروں کو قتل کیا۔ اگر حساب لگایا جائے تو کل غزوات میں قتل ہونے والے مشرکین و کافرین میں سے نصف سے زیادہ آپ کی تلوار ہی کی بھینٹ چڑھے۔ غرضیکہ آپ نے شجرِ اسلام کو اپنے خون سے سینچا ہے اور انھیں اسلامی خدمات کے باعث آپ کو مرتضیٰ (پسندیدہ و منتخب) کا لقب ملا۔ نیز آپ نے اپنے نفس کو مغلوب کر کے بوتراب کا خطاب حاصل کیا۔ مختصر یہ کہ آپ کا اٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا سب رضائے الٰہی کے حصول کے لیے تھا۔

(۱۵)

مرد کشور گیر از کرّاری است
گوہرش را آبرو خودداری است

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ انسان اس وقت فتوحات حاصل کر سکتا ہے جب کہ وہ دشمن پر بڑھ بڑھ کر متواتر حملے کرنے والا ہو۔ ایسے کرار غیر فرار کے ضمیر کی عزت خودداری سے قائم رہتی ہے۔ غزوۂ خیبر میں حضرات شیخین رضی اللہ عنہم باری باری مسلمانوں کے لشکر کو لے کر گئے لیکن ناکام لوٹے۔ چنانچہ آنحضور صلعم نے فرمایا "میں کل ایسے شخص کو علم دوں گا جو خدا اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہو گا اور خدا اور رسول اس کو دوست رکھتے ہوں گے۔ وہ کرار غیر فرار ہوگا۔ وہ پیٹھ نہیں پھیرے گا۔ خدا اس کے ہاتھ پہ فتح دے گا۔"[1] چنانچہ اگلے روز حضرت علی علیہ السّلام کو علم ملا اور آپ کی کراری سے قلعہ فتح ہو گیا۔ اقبال حضرت علی علیہ السّلام کے محب صادق ہیں۔ لہٰذا آپ کے تمام صفاتی ناموں کے اسرار بیان کر کے آپ کے علوئے مرتبہ کو ظاہر کرتے ہیں۔

(۱۶)

ہر کہ در آفاق گردد بوتراب
باز گرداند ز مغرب آفتاب

---

[1] تذکرۃ الیعسوب ترجمہ ارشاد القلوب صہ ۱۷

اقبالؔ کے نزدیک یہ امر مسلّم ہے کہ جو شخص اس دنیا میں "بوتراب" ہونے کا شرف پائے وہ آفتاب کو مغرب سے واپس لوٹلنے پر قادر ہو جاتا ہے۔
اقبال نے اسلامی تاریخ و احادیثِ نبوی کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ چنانچہ اس شعر میں وہ حضرت علی علیہ السلام کی ایک کرامت ردّ الشمس کا ذکر کرتے ہیں۔
حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم کی طرف وحی ہو رہی تھی اور آپ کا سر مبارک حضرت علیؑ کی گود میں تھا اور حضرت علیؑ نے اس حالت میں عصر کی نماز نہ پڑھی تھی حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا۔ بعد فراغتِ وحی کے رسول اللہ صلعم نے فرمایا "یا اللہ! یہ علی تیری اطاعت اور تیرے رسول کی اطاعت میں تھا تو اس کے لیے سورج کو واپس فرما۔" حضرت اسماء کہتی ہیں "میں نے دیکھا تھا کہ سورج غروب ہو گیا، پھر میں نے دیکھا کہ سورج بعد غروب کے طلوع کر آیا۔" حضرت علیؑ نے اٹھ کر وضو کیا اور نمازِ عصر پڑھی پھر سورج غائب ہو گیا۔ یہ واقعہ صہباد کا ہے جو خیبر اور مدینے کے درمیان ایک مقام ہے[۱]۔ ارشاد القلوب میں حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ سورج حضرت علی علیہ السلام کی دعا پہ لوٹا جو انھوں نے آنحضور صلعم کے حکم سے کی تھی۔ اسی کتاب میں جنگِ صفین سے واپسی پر بھی حضرت علیؑ کی دعا سے سورج کا واپس لوٹنا مرقوم ہے[۲]۔ اقبال نے حضرت علی کی کرامت

---

[۱] فلک النجاۃ جلد اوّل صفحہ ۴۶۹ ۔۔ ۴۷۰ بحوالہ خصائص کبریٰ سیوطی و طبرانی بروایت حضرت اسماء
[۲] تذکرۃ الیعسوب ترجمہ ارشاد القلوب ص ۲۹

ردِ الشمس کا ذکر آپ کی بارگاہِ ایزدی میں قربت کو ظاہر کرنے کے لیے کیا ہے۔

(۱۷)

ہر کہ زیں بر مرکبِ تن تنگ بست
چوں نگیں بر خاتمِ دولت نشست

اقبال ٹھیک کہتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو اپنے نفس پہ غالب ہو اس دنیا میں موقر و معزز رہتا ہے۔ بخلاف اس کے اگر انسان اپنی خواہشاتِ نفسانی کو ہی مغلوب نہ کرسکے تو وہ دنیا میں کارہائے نمایاں سر انجام نہیں دے سکتا۔

(۱۸)

زیرِ پاش اینجا شکوہِ خیبر است
دستِ او آنجا قسیمِ کوثر است

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السّلام نے خواہشاتِ نفسانی پر غلبہ پاکر اپنی رضا کی زمام اللہ تبارک و تعالیٰ اور آنحضور صلعم کی رضا کے سپرد کردی تھی۔ آپ کی روح اور آپ کا جسم دونوں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے لیے وقف تھے۔ اللہ اور اس کے رسول صلعم کی اطاعت نے دنیا میں آپ کو فاتح خیبر ہونے کا شرف بخشا اور آخرت میں آپ کے لیے قسیمِ کوثر ہونے کی فضیلت مقدر کردی ہے۔ بخاری شریف میں حضرت سہل بن سعد سے روایت ہے کہ انھوں نے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کو خیبر کے دن یہ فرماتے ہوئے سُنا "اب میں جھنڈا اس شخص کو دوں گا جس کے ہاتھ پہ فتح ہوگی۔" پس اس پہ صحابہ (اس) امید میں

کھڑے ہو گئے کہ ان میں سے کس کو جھنڈا ملتا ہے۔ چنانچہ دوسرے دن ہر شخص یہی امید کرتا رہا کہ جھنڈا مجھے عطا ہوگا۔ مگر آپؐ نے فرمایا "علیؓ کہاں ہیں؟" کسی نے کہا "ان کی آنکھوں میں درد ہے۔" آپؐ نے حکم دیا تو وہ آپ کے سامنے بلائے گئے۔ آپؐ نے ان کی دونوں آنکھوں میں لعاب (دہن) لگا دیا۔ جس سے وہ فوراً اچھے ہو گئے، گویا ان کو کچھ شکایت ہی نہ تھی۔ پھر حضرت علیؓ نے کہا۔ ہم ان کافروں سے جنگ کریں گے۔ حتیٰ کہ وہ ہماری مثل ہو جائیں۔ آپؐ نے فرمایا: "آہستگی کرو۔ جب تم ان کے میدان میں جانا تو ان کو اسلام کی طرف بلانا' اور جو ان پر فرض ہے اس سے ان کو آگاہ کرنا۔ سو قسم ہے خدا کی تمہاری وجہ سے ایک شخص بھی ہدایت پا جائے تو وہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بھی بہتر ہے۔" تاریخ شاہد ہے کہ آپ نے قلعدار مرحب کو قتل کر کے قلعے کو فتح کر لیا۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اسی خود سپردگی کے انعام میں ایک روایت کی رُو سے قیامت کے دن آپ سرکارِ دو عالم کے حکم سے مسلمانوں کو آبِ کوثر پلائیں گے۔

(۱۹)

از خود آگاہی ید اللّٰہی کند
از ید اللّٰہی شہنشاہی کند

حضرت علی علیہ السلام کو معرفتِ نفس حاصل تھی۔ جو شخص معرفتِ نفس حاصل کر لے اسے معرفتِ الٰہی حاصل ہو جاتی ہے چنانچہ صوفیا کا ایمان ہے کہ "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ" (جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا) اسی خود آگاہی نے آپ کو معرفتِ رسول و معرفت

اللہ تعالےٰ عطا کی - معرفت نے ترقی کر کے عشق کا درجہ پایا چنانچہ عشق الٰہی نے انھیں یداللہ بنا دیا - اور حبیب اللہ تعالےٰ نے آپ کو اپنی قدرت کا مظہر قرار دے کر ادیانِ باطلہ کا ابطال فرمایا تو آپ کائنات کے مالک ہو گئے - تمام غزوات میں کامیابی کا سہرا آپ ہی کے سر رہا - آنحضور صلعم کے ناصر و وزیر ہونے کی وجہ سے شہنشاہِ عرب آپ ہی تھے - غرضیکہ آپ نے خود آگاہی سے یداللّٰہی کا شرف اور یداللّٰہی سے شہنشاہی کی فضیلت پائی -

(۲۰)

ذاتِ او دروازۂ شہرِ علوم

زیرِ فرمانش حجاز و چین و روم

ترمذی اور حاکم میں حضرت علیؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا - یعنی یہ کہ میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں - طبرانی و حاکم نے بھی ابن عمرؓ سے اس حدیث کو بیان کیا ہے - اقبالؒ نے احادیثِ نبوی کا بغور مطالعہ کیا ہے - آپ نے اس حدیث کو صحیح سمجھا ہے - تاریخ شاہد ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے استفسار پر اپنے ایک غلط فیصلے کی تصحیح کرتے ہوئے فرمایا: لَوْ لَا عَلِیٌّ لَھَلَکَ عُمَرُ یعنی اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا - الغرض حضرت علی علیہ السلام کا دروازۂ شہرِ علوم ہونا مسلّم ہے - اقبالؒ کے نزدیک حضرت علی علیہ السلام علم کے سرچشمہ ہیں اور تمام دنیا میں علم دین الٰہی انہی کی بدولت پھیلا ہے - چنانچہ حجاز سے چینی ترکستان اور ایشیائے کوچک

تک آپ کی روحانی حکومت قائم ہے۔

(۲۱)

حکمراں باید شدن بر خاکِ خویش
تا مے روشن خوری از تاکِ خویش

انسان کو چاہیئے کہ وہ جذباتِ سفلی اور خواہشاتِ نفسِ امّارہ کو دبائے رکھے تاکہ اپنی فطری خوبیوں سے بہرہ اندوز ہو سکے اور روحانی ترقی کرنے کے قابل ہو جائے۔

(۲۲)

خاک گشتن مذہب پروانگی است
خاک را اب شو کہ این مردانگی است

اقبالؔ کے نزدیک انسان کو اپنی خودداری اور انفرادیت ہمیشہ قائم رکھنی چاہیئے۔ اپنے آپ کو خاک کر ڈالنا تو مذہب ناطاقتی ہے۔ دراصل طاقت ہی حق اور حق طاقت ہے۔ لہذا ہر انسان کو خاک پر فضیلت اور برتری قائم رکھنی چاہیئے۔ اس کی مردانگی یہی ہے کہ وہ خواہشات نفسانی سے کبھی مغلوب نہ ہو۔ اگر اس نے اپنی ہستی کو خاک میں ملا کر مقصد حاصل کیا تو بے فائدہ ہے۔ بات جب ہے کہ مقصد بھی حاصل ہو اور انفرادی حیثیت بھی قائم رہے۔

(۲۳ تا ۲۷)

سنگ شو اے ہمچو گُل نازک بدن تا شوی بنیادِ دیوارِ چمن

انہ گِل خود آدمے تعمیر کن — آدمے را عالمے تعمیر کن
گر بنا سازی نہ دیوار و درے — خشت از خاکِ تو بندد دیگرے
اے ز جورِ چرخ ناہنجار تنگ — جام تو فریادی بیدادِ سنگ
نالہ و فریاد و ماتم تا کجا — سینہ کوبیہائے پیہم تا کجا

اقبال رح مسلمان کو نصیحت کرتے ہیں کہ اسے تن آسان ہونے کی بجائے سخت جاں، محنتی اور جفاکش ہونا چاہیئے تاکہ وہ دنیا میں نشاۃ الثانیہ کے قیام کا بانی ہو سکے۔ اسے چاہیئے انسان ہونے کے تقاضوں کو پورا کرے۔ تاکہ دنیا میں خیر و خوبی کا دور دورہ ہو۔ اگر وہ خود اپنی تہذیب کی عمارت کی تعمیر شروع نہیں کرے گا تو دوسری اقوام اس کی قوم پر غالب آجائیں گی اور مسلمان قوم کے زوال پہ اپنی ترقی کے مینارۂ بلند کی بنیاد رکھیں گی۔

پند و نصائح کے بعد اقبال مسلمان کی موجودہ حرماں نصیبی و زبوں حالی کے نتیجے میں اس کے واویلا کا ذکر کرتے ہیں اور اسے اس فعلِ قبیح سے روکتے ہیں۔ ان کے نزدیک مسلمان کو رحمتِ خداوندی سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ کامیابی کے لیے جد و جہد جاری رکھنی چاہیئے۔

(۲۸ تا ۳۶)

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات — لذّتِ تخلیق قانونِ حیات
خیز و خلّاقِ جہانِ تازہ شو — شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
با جہانِ نامساعد ساختن — ہست در میداں سپر انداختن
مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار — با مزاجِ او بسازد روزگار

گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را — می دہد ترکیبِ نو ذرات را
گردشِ ایام را برہم زند — چرخِ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوتِ خود آشکار — روزگارِ نو کہ باشد سازگار
در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست — ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

اقبال کے نزدیک رازِ حیات عملِ پیہم میں پوشیدہ ہے۔ اور زندگی کا قانون نئی نئی چیزوں کی تعمیر کے شوق میں مضمر ہے۔ آپ زندگی کی نشانی حرکتِ مسلسل کو قرار دیتے ہیں۔ اس تمہید کے ساتھ آپ مسلمان کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اٹھے اور اپنے عملِ صالح سے نئی دنیا بسائے۔ پھر عشقِ حقیقی کو دل میں جگہ دے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی میں اصلاح کار میں مصروف ہو جائے۔ اگر وہ دنیا والوں کی کج روی سے مفاہمت کرے گا اور اعلانِ حق کا تارک ہوگا تو اسے جان لینا چاہیئے کہ اس نے گردشِ زمانہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ خوددار آدمی ہمیشہ جفاکش ہوا کرتا ہے اور وہ اس قدر عزم بالجزم رکھتا ہے کہ زمانے کو اس کے سامنے جھکنا پڑتا ہے اور وہ اپنی من مانی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے زمانہ اس کا ساتھ نہ دے تو وہ آسمان تک سے مصروفِ پیکار ہو جاتا ہے۔

آپ نے ایک دوسرے مقام پر بھی فرمایا ہے ؎

حدیثِ بے خبراں ہے کہ با زمانہ بساز
زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

اقبالؔ حالاتِ زمانہ سے مغلوب ہونے کو غلامی و محکومی قرار دیتے ہیں۔ خود دار شخص کے ساتھ اگر زمانہ چلنے کے لیے تیار نہ ہو تو وہ کائنات کو زیر و زبر کر کے اسے بہ ترتیبِ احسن ترکیب دیتا ہے۔ وہ زمانے کا راکب ہوتا ہے۔ لہذا اسے اپنی منشاء کے مطابق چلاتا ہے۔ وہ اپنی خدا داد قابلیت و طاقت سے نیا زمانہ اپنے مزاج کے مطابق پیدا کر لیتا ہے۔ اس کا اصولِ حیات یہی ہے کہ جب تک وہ زندہ رہے زمانے کا مردانہ وار مقابلہ کر کے معزّز و موقّر رہے اور اگر یہ ناممکن ہو جائے تو بہادروں کی طرح جان دے کر حیاتِ دوام حاصل کرے۔

(۳۷ تا ۴۰)

آزماید صاحبِ قلبِ سلیم	زورِ خود را از مہمّاتِ عظیم
عشق با دشوار ورزیدن خوش است	چوں خلیل از شعلہ گل چیدن خوش است
ممکناتِ قوّتِ مردانِ کار	گردد از مشکل پسندی آشکار
حربۂ دوں ہمتاں کیں است و بس	زندگی را ایں یک آئیں است و بس

وہ لوگ جو قلبِ مطمئن کے مالک ہوتے ہیں اپنی خدا داد طاقت کو بڑی مہمّات میں پڑ کر آزماتے ہیں۔ انھیں تن آسانی سے نفرت اور جفاکشی سے محبت ہوتی ہے۔ وہ مشقت میں پڑنا اس لیے پسند کرتے ہیں تاکہ معشوقِ حقیقی سے تعلق کی راہ میں صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے بھی خوش رہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ عشق کا تقاضا یہی ہے کہ طلبِ معشوق میں آگ تک میں برضا و رغبت کود جائے۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی مثال کو پیش نظر

رکھتے ہیں جنھوں نے عشقِ حقیقی کی راہ میں آگ میں کودنا پسند فرمایا اور عاشقانِ حق کے لیے ایک شریعت قائم کر گئے۔ اگر سچ پوچھا جائے تو کارگزار جوانمردوں کے مبادیِ عمل کی حدود جفاکشی اختیار کرنے سے ہی متعین ہوا کرتی ہیں۔ بخلاف اس کے پست ہمت لوگ ہمیشہ بغض، حسد، مکر اور دشمنی جیسے ناپاک حربے استعمال کرتے ہیں اور ان کی یہی عادتیں پختہ ہو کر ان کی زندگی کا بنیادی اصول بن جاتی ہیں۔ اقبالؔ جفاکشی، مشقت، تندہی اور عملِ پیہم سے محبت کرتے ہیں اور مکر و زور، بغض و عداوت اور تن آسانی و کاہلی کو مذموم قرار دیتے ہیں۔

(۴۱ تا ۴۵)

زندگانی قوتِ پیداستے — اصلِ او از ذوقِ استیلاستے

عفوِ بیجا سردیِ خونِ حیات — سکتہ در بیتِ موزونِ حیات

ہر کہ در قعرِ مذلت ماندہ است — ناتوانی را قناعت خواندہ است

ناتوانی زندگی را رہزن است — بطنش از خوف و دروغ آبستن است

از مکارم اندرونِ او تہی است — شیرش از بہرِ ذمائم فربہی است

زندگی درحقیقت قوتِ تخلیق سے تعبیر ہے اور اس کی بنیاد ذوقِ غلبہ پر قائم ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسی انسان کو زندہ قرار دیا جا سکتا ہے جو کارہائے نمایاں سر انجام دینے میں مصروفِ کار رہے اور غلبہ و تسلط کے عزمِ صمیم سے غلط کار اور کج رو دنیا کو پامال کر کے اصلاحِ کارِ جہاں کی طرف تندہی سے متوجہ ہو۔ اس کے نزدیک بدنہاد لوگوں کو معاف کرنا

دون ہمتی اور بزدلی ہے، جس سے انسانی زندگی عملی طور پر معطل ہو کر رہ جاتی ہے اور اس کا یہ تعطّل اسے ذلت کے گڑھے میں گرا دیتا ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ جو شخص ذلت کی زندگی گزارنے کا عادی ہو جائے وہ اپنی پست حالت اور ناطاقتی کو قناعت کہہ کر دل بہلا لیتا ہے۔ دراصل وہ یہ نہیں جانتا کہ کمزوری زندگی کی اعلیٰ اقدار کو ملیا میٹ کر دیتی ہے۔ اس کے دل پہ خوف مسلط ہو جاتا ہے۔ اور دروغ گوئی اس کی عادتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ وہ مکارمِ اخلاق کو قطعاً ترک کر کے بُرے کام بڑی دلیری سے کرتا ہے۔

ان اشعار میں اقبالؒ نے طاقت کی عظمت بیان کی ہے اور کمزوری کو مذموم قرار دیا ہے۔ آپ کے نزدیک طاقت مکارمِ اخلاق سکھاتی ہے اور اس طرح زندگی کی اصلاح کر کے اسے کامیاب کرتی ہے۔ بخلاف اس کے کمزوری مذموم عادات و اطوار پیدا کر کے انسانی زندگی کو تباہ و برباد کر کے قعرِ مذلت میں دھکیل دیتی ہے۔

(۴۶ تا ۵۱)

ہوشیار اے صاحبِ عقلِ سلیم — در کمینہا می نشیند این غنیم

گر خردمندی فریبِ او مخور — مثلِ حربا ہر زماں رنگش دگر

شکلِ او اہلِ نظر نشناختند — پردہ ہا بر روئے او انداختند

گاہ او را رحم و نرمی پردہ دار — گاہ می پوشد ردائے انکسار

گاہ او مستور در مجبوری است — گاہ پنہاں در تہِ معذوری است

چہرہ در شکلِ تن آسانی نمود دل ز دستِ صاحبِ قوت ربود

علامہ اقبال ناتوانی کی برائیاں ظاہر کرنے اور اس کے نقصانات شمار کرانے کے بعد ہر سمجھدار انسان کو خبردار کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اے عقلِ سلیم کے مالک! ہوشیار رہ کہ تیری گھات میں تیری دشمن "ناتوانی" مستعد بیٹھی ہے۔ اگر تو عقل مند ہے تو ہرگز اس کے فریب میں نہ آنا۔ خبردار! یہ عیارہ گرگٹ کی طرح ہر وقت اپنا رنگ بدلتی رہتی ہے۔ اس کے چہرے پر کئی نقاب پڑے ہوتے ہیں، لہٰذا بصارت والے بھی اسے نہیں پہچان سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ کبھی تو "ناطاقتی" اپنی ظاہری مجبور، مقہور اور کس مپرسی کی حالت پہ رحم و نرمی کا پردہ ڈال لیتی ہے، کبھی خاکساری و انکسار کی چادر اوڑھ لیتی ہے، کبھی لاچاری کا نقاب منہ پہ ڈال لیتی ہے اور کبھی معذوری کی اوٹ لے لیتی ہے۔ چنانچہ تن آسانی کی صورت اختیار کرکے طاقتور انسان کے دل کو بھی اڑا لے جاتی ہے۔ اور اس طرح مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعے اس کی زندگی کو ناکامی و نامرادی میں بدل کر اس پر مستقل مایوسی مسلط کردیتی ہے، جس کی وجہ سے وہ اسی ذلت پہ قانع ہو کر ہمیشہ کے لیے گڑھے میں پڑا رہ جاتا ہے۔"

ملاحظہ کیجیے ان اشعار میں اقبال نے کس خوش اسلوبی سے ہمیں ناطاقتی سے مجتنب رہنے کی ہدایت کی ہے۔ دراصل آپ کے نزدیک "ناتوانی" ذلت ہی کا دوسرا نام ہے۔

(۵۲ تا ۵۶)

با توانائی صداقت توام است
گر خود آگاهی ہمیں جامِ جم است

زندگی کشت است و حاصل قوت است
شرحِ رمزِ حق و باطل قوت است

مدعی گر مایہ دار از قوت است
دعوئ او بے نیاز از حجت است

باطل از قوت پذیرد شانِ حق
خویش را حق داند از بطلانِ حق

از کُنِ او زہر کوثر می شود
خیر را گوید شرے شر می شود

علامہ اقبال "ناتوانی" کی مختلف صورتیں بتلانے، اس کے مکر و فریب اور نقصانات سے آگاہ کرنے کے بعد اب توانائی کے فوائد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ توانائی بس صداقت کا دوسرا نام ہی سمجھ لیجیے۔ چنانچہ اگر انسان طاقتور ہو تو حق کو پا بھی لیتا ہے اور اس کا نام بھی بلند کرتا ہے۔ اور اگر وہ "توانائی" کا صحیح مفہوم ذہن نشین کرنے میں کامیاب ہو جائے تو یہ اس کے لیے جام جم کا کام دیتی ہے۔ طاقت اس کو راحت و مسرت خوشی عطا کرتی ہے۔ اگر زندگی کو کھیتی سے تعبیر کیا جائے تو اس کی پیداوار کو "توانائی" قرار دیا جاسکتا ہے۔ حق و باطل کے راز کو کھول کر پیش کرنے والی "طاقت" ہی ہے۔ اثبات حق بذریعہ طاقت ہی ہوا کرتا ہے۔ اگر مدعی طاقتور ہے۔ تو اس کے دعوے کو کسی دلیل، برہان اور ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ طاقت ہی بعض اوقات باطل کو حق کی شان عطا کر دیتی ہے اور باطل اسی کی معاونت سے حق کو شکست فاش دے کر جھٹلاتا ہے اور خود کو ابطال حق سے حق قرار دے لیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے کرنے سے مذموم محمود

تلخ شیریں اور زہر کو شہد ہو جاتا ہے۔ نیز اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر وہ بھلائی کو برائی کہہ دے تو دنیا میں اسے برائی کا نام ہی دے دیا جاتا ہے اور اسے برائی کے نام سے ہی یاد کیا جانے لگتا ہے۔

(۵۷)

اے ز آداب امانت بے خبر
از دو عالم خویش را بہتر شمر

ارشاد باری تعالے ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

تحقیق ہم نے (اپنی) امانت پیش کی آسمان، زمین اور

وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا

پہاڑوں پر۔ پس انہوں نے قبول نہ کیا کہ اس کو اٹھائیں اور

وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط

اس سے ڈر گئے لیکن انسان نے اس کو اٹھا لیا۔

یہ امانت جو انسان کو عطا ہوئی خلافت الٰہیہ ہے۔ حافظ شیرازی نے اس عطائے امانت کو یوں باندھا ہے ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

انسان نے اس امانت کو قبول کر کے اپنے نفس پہ بہت بڑی ذمہ داری عاید کی اور یہ ایک طرح سے اس سے نادانی ہی ہوئی۔ اب اس امانت کے قبول

کرنے کے بعد اگر اس نے اس کے تقاضے بطریق احسن پورے کر دیئے تب تو فبہا، وگرنہ وہ بڑے خسارے میں رہا۔ اگر بنظرِ تحقیق دیکھا جائے تو انسان اس امانت کے شرف کی وجہ سے ہی اشرف المخلوقات بنا، اور حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے فرشتوں تک کو تعظیمی سجدہ کرنا پڑا۔ اقبالؔ انسان کو اس کے بلند مرتبے سے آگاہ کرتے ہوئے ہدایت کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی امانت یعنی "خلافت فی الارض" کے تقاضوں کو بخوبی پورا کرے اور اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتے ہوئے زندگی کے مقاصد پورے کرے۔

از رموزِ زندگی آگاہ شو (۵۸)

ظالم و جاہل ز غیر اللہ شو

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ انسان کو زندگی کے بھیدوں سے واقف ہونا چاہیئے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اسے زندگی عطا کی، اشرف المخلوقات بنایا اور زمین میں اپنا خلیفہ مقرر فرمایا۔ لہٰذا اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے منیب کی اطاعت میں اپنی زندگی گزارے اور غیر اللہ کو اپنا مطیع سمجھ کر ان پر حاوی رہے۔ اگر اس نے "ماسوا" کی اطاعت کی تو اپنے مرتبے سے گر گیا اور اپنی زندگی کو بے کار ضائع کیا۔ حیاتِ انسانی کے رموز میں سب سے اہم حصولِ رضائے الٰہی ہے۔ جس نے اسے حاصل کر لیا۔ وہ کامیاب ہوا اور جو اسے حاصل نہ کر سکا وہ برباد ہوا۔

(۵۹)

چشم و گوش و لب کشا اے ہوشمند

گر نہ بینی راہِ حق بر من بخند [1]

مولانا روم نے فرمایا ہے :-

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند

گہ نہ بینی نورِ حق بر من بخند

مولانا روم انسان کے ظاہری حواس سے صرفِ نظر کر کے اس کے باطنی حواس کے روشن کرنے کے خواہاں ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ اگر وہ ظاہری حواس کو معطل کر کے باطنی حواس کو اجاگر کرے تو یقینی طور پر وہ اللہ تعالیٰ کا نور دیکھ سکے گا۔ معرفتِ حق ظاہری حواس سے نہیں ہوتی اس کے لیے باطنی حواس کا مصروفِ عمل ہونا ضروری ہے۔ اقبال بھی یہی کہہ رہے ہیں لیکن بطریقِ دگر۔ وہ بھی جس آنکھ، کان اور لب کے کھولنے کا حکم دے رہے ہیں وہ درحقیقت باطنی ہی ہیں۔ ظاہری حواس سے تو معرفتِ الٰہی کا ادراک کوئی نہیں کر سکتا۔ اس قادرِ مطلق ہستی کو تو باطنی حواس کی روشنی ہی میں پہچانا جاتا ہے۔

اقبالؒ نے حضرت علی علیہ السلام کے اسماء کے اسرار کی تشریح کے بعد روح کی رفعت، خاک کی پستی، عشق کے نیک اثرات، عملِ پیہم کے فوائد،

---

[1] اسرار و رموز از اقبال (در شرح اسرار اسمائے علی المرتضیٰ رضؓ) صفحہ ۵۲ تا ۵۷

خودداری و آزادمنشی کی شان، جفاکشی کے فیوض، توانائی کی برکات، ناتوانی کے نقصانات، مکارمِ اخلاق کے اعزاز، ذمائم کی ذلتیں، انسان کی فضیلت اور غیر اللہ سے قطع تعلق کا بیان کیا ہے۔ انھوں نے آخیر میں ہمیں ہدایت کی ہے کہ ہم ان کے بیان کیے ہوئے تمام عوامل کو ان کی زیرِ ہدایت کارفرما رہنے دیں تاکہ ہمارا ضمیر حضرت علی علیہ السلام سے نورِ ہدایت حاصل کرے اور ہم اپنے حواسِ باطنی کے ذریعے اسے مستقل طور پر قبول کر کے صراطِ مستقیم پر گامزن ہوں، تاکہ اس کے نتیجے میں رضائے الٰہی کو حاصل کر کے زندگی میں کامیاب و بامراد رہیں۔

نعرۂ حیدرؓ نوائے بوذرؓ است

گرچہ از حلقِ بلالؓ و قنبرؓ است [۱]

دینِ اسلام نے مسلمانوں کو ایسے محکم طریق پہ ایک لڑی میں پرو دیا ہے کہ ایک کا درد دوسرے کا درد، ایک کی خوشی دوسرے کی خوشی، ایک کا رنج دوسرے کا رنج، ایک کی دشمنی دوسرے کی دشمنی اور ایک کی صلح دوسرے کی صلح ہے۔ اس دینِ اکمل نے مسلمانوں کو یہاں تک فیض پہنچایا کہ وہ لاکھوں قالب ہوتے ہوئے بھی یک جان تھے۔ ان میں اخوت نے یہاں تک استحکام پکڑا کہ حضرت علی علیہ السلام اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی باتیں حضرت بلالؓ

---

[۱] اسرار و رموز ص۱۲۲ (حکایت بو عبید و جابان در معنی اخوتِ اسلامیہ)

اور حضرت قنبرؓ (جو کبھی غلام رہ چکے تھے) کی زبان سے اعلانِ عام پا جایا کرتی تھیں۔ اقبالؔ اس زمانہ میں بھی مسلمانوں سے عدمِ مساوات کو ختم کر کے ان میں سابقہ اخوت کا قیام چاہتے ہیں تاکہ یکجہتی اور اتفاق کی برکت سے وہ دوبارہ عروج حاصل کر سکیں۔

چوں علیؓ در ساز با نانِ شعیر
گردنِ مرحب شکن خیبر بگیر [1]

حضرت علی علیہ السلام بہت سادہ اور معمولی غذا تناول فرمایا کرتے تھے۔ جَو کی روٹی آپ کی مرغوب غذا تھی۔ بعض اوقات باسی روٹیوں کو پانی میں بھگو کر نرم کرتے تب اس سے بھوک کو رفع فرماتے۔ اس سادہ غذا سے اللہ تعالےٰ نے آپ میں وہ طاقت پیدا کی کہ خیبر کے قلعوں میں سے جب قلعۂ قموص جو مرحب کا تخت گاہ تھا کسی طرح فتح نہ ہو سکا اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابہ ناکام لوٹے تو آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا "کل میں اس شخص کو عَلَم دوں گا جس کے ہاتھ پر خدا فتح دے گا جو خدا اور اس کے رسولؐ کو چاہتا ہے اور خدا اور رسولؐ اس کو چاہتے ہیں۔"

چنانچہ صبح کو آنحضور صلعم نے حضرت علیؓ کو بُلا کر عَلَم عطا فرمایا اور جہاد کا حکم دیا۔ جب حضرت علیؓ قلعے کے سامنے پہنچے۔ مرحب قلعے سے یہ رجز پڑھتا ہوا نکلا:

---

[1] اسرار و رموز ص ۱۸۳ (در تفسیر سُورۂ اخلاص)

"قد علمت خیبر انی مرحب
شاکی السلاح بطل مجرب
اذ القلوب اقبلت تلھب"!

خیبر جانتا ہے کہ میں ہتھیار سجانے
والا بہادر اور تجربہ کار مرحب ہوں۔
جب لوگوں کے ہوش مارے جاتے ہیں
تو میں بہادری دکھاتا ہوں۔

حضرت علی علیہ السّلام نے جواباً رجز پڑھا:

"انا الذی سمتنی امی حیدرہ
اکیلکم بالسیف کیل السندرہ
کلیث غابات شدید قسورہ"

میں ہوں کہ میری ماں نے میرا نام شیر غضبناک رکھا ہے۔ میں اپنی تلوار کی سخاوت سے بڑے بڑے پیمانے عطا کروں گا۔ میں شیر ببر سخت حملہ آور ہژبر میدان ہوں۔

اور ایک ہی ہاتھ تلوار کا ایسا لگا کہ مرحب کے خود آہنی کو کاٹتا، عمامہ کو قطع کرتا، سر کے دو ٹکڑے بناتا ہوا گردن تک جا پہنچا۔[1] چنانچہ مرحب بے جان ہو کر واصلِ جہنم ہوا۔

اقبال مسلمانوں کو مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ حضرت علی علیہ السّلام کی پیروی میں سادہ غذا کھائیں اور اپنے اندرونی مرحب یعنی نفسِ امّارہ کو مغلوب کر لیں۔

ہزار خیبر و صد گونہ اژدر است اینجا
نہ ہر کہ نانِ جویں خورد حیدری داند[2]

---

[1] رحمۃ اللعالمین جلد اوّل صفحہ ۲۹۰ بحوالہ طبری جزو ثالث صفحہ ۹۴

[2] پیام مشرق از اقبال صفحہ ۲۱۰

روایت ہے کہ حضرت علی علیہ السّلام نے شیر خوارگی کے زمانے میں جب آپ جھولنے میں لیٹے تھے ایک اژدہے کے گلّے چیر ڈالے تھے جب کہ اس نے آپ کو غذائے نرم سمجھ کر حملہ کر دیا تھا۔ آپ ہی نے جوان ہو کر معرکۂ خیبر کو سر کیا۔ یہ کارہائے نمایاں اس شخص نے سرانجام دیے جس کی غذا جَو کی خشک روٹی تھی۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس دنیا میں معبودانِ ماسوا کے ہزارہا خیبر اور خواہشاتِ نفسانی کے سینکڑوں اقسام کے اژدھے انسان کو دعوتِ مبارزت دیتے رہتے ہیں۔ انسان پہ فرض ہے کہ وہ حضرت علی علیہ السّلام کی پیروی کرتے ہوئے نانِ جویں کھا کر ان سب کو شکستِ فاش دے لیکن مشکل تو یہ ہے کہ ہر شخص آپ کی پیروی کے لائق جوہرِ قابل نہیں رکھتا۔ لہٰذا اگر وہ جَو کی روٹی کو غذا بنانے میں آپ کی پیروی بھی کرلے تب بھی وہ نفسِ امّارہ پہ غلبہ حاصل نہیں سکتا۔

ہے اس کی طبیعت میں تشیّع بھی ذرا سا
تفضیلِ علیؑ ہم نے سُنی اس کی زبانی [۱]

اقبال نے ایک مولوی صاحب کی زبانی اپنی تمام صفات کا جستہ جستہ ذکر کیا ہے۔ مثلاً شعر میں رشکِ کلیم ہمدانی، عقیدے پہ اثرِ فلسفہ دانی، طبیعت میں تفضیلِ علیؑ، حسن فروشوں سے عار نہ ہونا، شب کو گانا تو سحر کو تلاوتِ کلامِ پاک،

---

[۱] بانگِ درا ص۱۵۱ (زہد و رندی)

دل دفترِ حکمت، طبیعت خفقانی، رندی سے آگاہی، شریعت سے واقفیت اور تصوف میں منصور کا ثانی ہوتا۔ آپ اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ اگر انھوں نے اپنی فضیلتوں کا خود ذکر کیا تو لوگ "ثنائے خود بخود کردن نمی زیبد مرد دانا را" کہہ کر انھیں مطعون کریں گے۔ آپ مولانا روم کے اس شعر پر یقین رکھتے تھے، کہ:

خوشتر آں باشد کہ رازِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

لہٰذا آپ نے مولوئ معنوی کے اسی نسخے پہ عمل کرتے ہوئے اپنی تمام خوبیاں دلچسپ پیرائے میں بطریقِ احسن ایک مولوی صاحب سے شمار کرادی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبالؔ تفضیلِ علیؓ کے قائل تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ منقبتِ علیؓ میں وہ جس قدر سرخوش، پُرجوش اور مخلص نظر آتے دوسرے کسی صحابی رضی اللہ عنہ کی تعریف میں دکھائی نہیں دیتے۔ اس سے صرفِ نظر نہیں کہا جاسکتا کہ آپ کو رسول اللہ صلعم سے عشق تھا اور انہی کے تعلق کی وجہ سے صحابہ کرام سے بھی تعلق رکھتے تھے تاہم اگر ہم بنظرِ تحقیق دیکھیں تو آپ کا حضرت علیؓ سے جو تعلقِ خاطر اور اخلاصِ محبت پائیں گے وہ کسی دوسرے سے سوائے آنحضرت صلعم کے ملنا دشوار ہے۔ آپ آنحضور صلعم کو مدینۃ العلم تو حضرت علیؓ کو باب مدینۃ العلم، آنحضورؐ کو دارالحکمت تو حضرت علیؓ کو باب دارالحکمت اور آنحضرت صلعم کو عشق تو حضرت علیؓ کو سرمایۂ ایمانِ عشق سمجھتے تھے۔ آپ خاکِ مدینہ و نجف کو اپنی آنکھوں کے

لیے سرمہ قرار دیتے تھے۔ مختصر یہ کہ آپ کو ان دونوں مقدس ہستیوں سے صرف محبت ہی نہیں بلکہ والہانہ عشق تھا۔ چنانچہ بدیں وجہ آپ حضرت علیؑ کی محبت کو رسول مقبول صلعم کی محبت اور آنحضورؐ کے عشق کو حضرت علیؑ کا عشق قرار دیتے تھے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ آپ تفضیل علیؑ کے قائل ہوتے ہوئے آنحضرت صلعم کی سنت پہ قائم نظر آتے ہیں۔ آپ حضرت علیؑ کی تفضیل کے مقر بوصوف کی بے مثال شجاعت، بے بدل علم، فقید المثال خدماتِ دینِ اسلام، گرانقدر نصرتِ رسولؐ اور لاثانی زہد و اتقا کے سبب سے تھے۔ آپ نے اسلامی تاریخ اور احادیثِ نبوی کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ ایک مسلمان کے لیے اسوۂ محمد صلعم کے بعد اسوۂ علیؑ ہی قابلِ تقلید ہے۔ لہذا بلاشک وشبہ فضیلت و برگزیدگی کے اعتبار سے آنحضرت صلعم کے بعد حضرت علیؑ کا ہی درجہ ہے۔

(۲)

حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟ [۱]

آنحضور صلعم نے فرمایا ہے "اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ" یعنی مجھے اپنے فقر پہ فخر ہے۔ حضرت علی علیہ السلام بھی اپنے فقر پہ ہمیشہ قانع رہے ہیں۔ جناب فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا کے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے گھٹے پڑ گئے تھے۔

---

[۱] بانگِ درا صـ ۲۲۷ (جوابِ شکوہ)

حضرت علیؓ یہودی امیروں کے باغوں کو پانی دے کر قلیل مزدوری پاتے اور کھانے پکانے کے لیے سامان خرید لاتے۔ کھانا تیار ہونے پہ دق الباب ہوتا اور سائل طعام کے لیے سوال کرتا۔ آپ تمام کھانا اسے دے دیتے اور گھر والے اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے رات کو بھوکے سو جاتے۔ حضرت عثمانؓ صاحب ثروت تھے تو ان کا فیض بھی احباب کے لیے جاری رہتا تھا۔ اقبالؒ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں نہ تو حیدری فقر ہے کہ ناداری پہ اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کیا جاتا ہو اور نہ ہی دولتِ عثمانی ہے کہ اس سے حاجتمند مسلمانوں کی مدد ہوتی ہو۔ ہمارے امرا دولت کو بڑھانے کی فکر میں رہتے ہیں اور اپنے ضرورت مند مسلمان بھائیوں کی کوئی مدد نہیں کرتے۔ یہ لوگ اپنی دولت کے نشے میں مست ہو کر اللہ تعالےٰ سے دُور جا پڑے ہیں۔ اس زمانے کے غربا اپنی غربت کی وجہ سے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر شکووں کا دفتر کھول بیٹھتے ہیں اور اللہ تعالےٰ کی اطاعت و عبادت سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ الغرض آج کل کے امرا و غربا دونوں صراطِ مستقیم کو چھوڑ چکے ہیں۔ جب ہم لوگوں کی یہ حالت ہے تو پھر ہم اپنے اسلاف سے روحانی رشتے کے قیام کا دعویٰ کرنے میں ہرگز حق بجانب نہیں ہیں۔ جب نوح علیہ السلام کا بیٹا غیر صالح عمل کی وجہ سے ابنیت سے خارج ہو گیا تو ہم اپنے نیک بزرگوں سے روحانی رشتے کے دعویدار کیوں کر ہو سکتے ہیں جب کہ ہمارے اعمال بھی غیر صالح ہیں۔

(۳)

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری [۱]

علامہ اقبال کا خیال ہے کہ معشوقِ حقیقی کے عشق کی چنگاری ہی انسان کو کمال تک پہنچاتی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کے دل میں اللہ تعالےٰ کی محبت جاگزیں تھی۔ چنانچہ اسی محبت کے فیض کی بدولت آپ نے اپنے فقر کی کبھی پروا نہ کی اور خشک نانِ جویں پہ زندگی گزارتے ہوئے تمام غزوات میں اپنے خدائی مدد یافتہ طاقتور ہاتھ میں ذوالفقار سنبھالے دینِ حق کے اثبات اور دینِ باطل کے ابطال میں مصروف رہے۔ لہذا مسلمان کو بھی چاہیئے کہ وہ دنیا میں جَو کی روٹی کھاتے ہوئے اپنے فقر کا خیال نہ کرے اور مالکِ حقیقی سے محبت کا رشتہ جوڑ کر اثباتِ حق کے لیے کوشاں رہے۔

(۴)

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری [۲]

حق و باطل کی عداوت اس وقت سے شروع ہے جب کہ ابلیس نے اللہ تبارک و تعالےٰ کے حکم سے سرتابی کی۔ دنیا میں حضرت آدمؑ کی آمد بھی

---

[۱] بانگ درا ص ۲۸۴ (میں اور تو)

[۲] بانگِ درا ص ۲۸۵ (میں اور تو)

ابلیس کے ہتھکنڈوں کے باعث ہی عمل میں آئی ۔ ابلیس بھی اس دنیا میں پہنچا اور یہاں باطل کے مستقل اڈے کا قیام عمل میں آیا ۔ اس نے قابیل کے دل میں تخم باطل بویا ۔ چنانچہ اس نے ہابیلؑ کو ناحق قتل کیا ۔ اس کی کارفرائیوں نے قوم نوحؑ کو گمراہ کیا جنھوں نے حضرت نوح علیہ السّلام پہ ظلم وستم کیے ۔ اسی ہستئ باطل کا تسلط نمرود، فرعون، ابوجہل، مرحب وعنتر اور یزید پہ ہوا جنھوں نے ابراہیمؑ، موسیٰؑ، محمد صلعم، علیؑ اور حسین علیہ السّلام کے خلاف صف آرائیاں کیں ۔ غرضیکہ حق و باطل کی جنگ آفرینشِ کائنات سے چلی آرہی ہے اور قیامت تک جاری رہے گی ۔ اس شعر میں اقبال اسی حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کے زمانے میں بھی باطل کی فتنہ پردازیاں اسی زور وشور سے جاری ہیں جیسی کہ آنحضور صلعم کے زمانے میں جاری رہی ہیں ۔ مزاج باطل کبھی نہیں بدلتا ۔ وہ ہمیشہ حق کے خلاف صف آرا رہتا ہے تاکہ ہر ممکن طریق سے اسے زک پہنچائے ۔

(۵)

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ[۱]

روم و ایران کی سلطنتیں ترقی یافتہ و متمدن تھیں مطلق العنان حکومتوں میں عموماً ظلم وستم کا دور دورہ ہوا کرتا ہے، بدیں وجہ کہ کچھ لوگ قربِ امر

---

[۱] بانگِ درا ص ۳۰۸ (طلوعِ اسلام)

کے سبب قوی ہو کر عوام الناس کو لوٹ کر مفلس بنا دیتے ہیں اور حصولِ زر کے لیے ان پر ظلم کرتے ہیں۔ یہ طبقاتی عدم مساوات استبداد کو جنم دیتی ہے۔ آنحضور صلعم نے عربوں کو اسلام پر اکٹھا کیا جس کے لیے آپ کو لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ ان لڑائیوں نے جہاں عربوں کو توحید کا سبق دیا وہاں ان میں صداقت و قناعت کو رواج دینے کا بھی سبب بنیں۔ حضرت علی علیہ السلام کی شجاعت و قوت نے جہاں اسلام کا بول بالا کیا وہاں حضرت ابوذرؓ کی قناعت پسندی اور حضرت سلمان فارسیؓ کی صدق دلی نے بھی کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ آپ ہی وہ مقدس ہستیاں ہیں جن کی بدولت اسلام کو استحکام نصیب ہوا۔ چنانچہ مسلمانوں نے روم و ایران کی مطلق العنان حکمران طاقتوں کو ختم کر دیا اور ان کے استبداد کو عدل و مساوات سے بدل ڈالا۔

---

(۱۱)

گہے با حق در آمیزد، گہے با حق در آویزد

زمانے حیدری کردہ، زمانے خیبری کردہ [۱]

اقبال فرماتے ہیں کہ ان کا دل ان کے قابو میں نہیں ہے کبھی تو وہ دینِ حق کا مددگار ہوتا ہے اور کبھی دینِ حق سے برسرِ پیکار ہو جاتا ہے۔ ایک موقع پر تو وہ خواہشاتِ نفسانی پر اس طرح قابو پا لیتا ہے جس طرح حضرت علی علیہ السلام

---

[۱] زبورِ عجم از اقبال صفحہ ۴۲

نے خیبر پر قبضہ کر لیا تھا، اور دوسرے موقعہ پر وہ حق سے بغاوت کرکے اس طور سے سفلی خواہشات کا ساتھ دیتا ہے جیسے خیبر والوں نے اہلِ حق سے سرکشی کی تھی۔ اس شعر میں اقبال نے مسلمانوں کی زبوں حالی کا ذکر کیا ہے۔ آجکل مسلمانوں کے دلوں سے اطمینان سلب ہو چکا ہے۔ کبھی تو وہ حق کا ساتھ دینے کے لیے سینہ سپر ہو جاتے ہیں اور کبھی حق کی مخالفت پر کمربستہ ہوتے ہیں۔ غرضیکہ ایمان نے ابھی تک ان کے دلوں میں پوری طرح قرار نہیں پکڑا ہے۔

(۲)

امیرِ قافلہ سخت کوش و پیہم کوش
کہ در قبیلۂ ما حیدری نہ کراری است[۱]

اقبال فرماتے ہیں کہ مسلمان امیرِ قافلۂ کاروانِ حیات ہے۔ بدیں وجہ اسے جفاکش اور ہمیشہ تگ و دو میں مصروف رہنے والا ہونا چاہیے کہ دینِ اسلام میں کامیاب فاتح وہی ہے جو حوصلہ نہ ہارے اور بڑھ بڑھ کر اس وقت تک حملے کرتا رہے جب تک کہ دینِ باطل پوری طرح نیست و نابود نہ ہو جائے۔

(۳-۴)

من آں علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را
بہر نرخے کہ ایں کالا بگیری سود مند افتد
بزورِ بازوئے حیدر بدہ ادراکِ رازی را[۲]

---

[۱] زبورِ عجم صہ ۱۰۸ [۲] زبورِ عجم صہ ۱۴۹

اقبالؒ کے نزدیک وہ علم و حکمت اور فلسفہ بے فائدہ ہے جو جنگجو اور سرفروش مسلمان کو تیغ و سپر کے صحیح استعمال سے غافل کر دے۔ مسلمان کو چاہیئے کہ ادراک رازی یعنی فلسفۂ حکیم رازی کو حضرت علی علیہ السلام کی پیروی میں قوت و کراری کے صحیح استعمال پر قربان کر ڈالے۔ سچ تو یہ ہے کہ علیؑ کا تیغ ایسی گرانقدر جنس ہے کہ اسے جس قیمت پر بھی خریدا جائے عین صواب قرار پائے گا اور فائدہ مند ہی رہے گا۔

---

(۱)

عشق با نانِ جویں خیبر کشاد
عشق در اندام مہ چاکے نہاد [۱]

اقبال حضرت علی علیہ السّلام کو سرمایۂ ایمان عشق قرار دیتے ہیں چنانچہ یہاں آپ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے عشقِ حقیقی میں سرمست تھے، لہذا جَو کی روٹی کھاتے ہوئے بھی فاتح خیبر ہونے کا شرف حاصل کر لیا۔ آپ کے نزدیک یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ عاشق کو وسیع النظرف ہونا چاہیے۔ حضرت علیؑ نیک گوہر اور وسیع النظرف تھے۔ آپ نے عشقِ حقیقی سے قوّت حاصل کی اور خیبر کو فتح کر لیا۔ بخلاف اس کے چاند نے بھی انوارِ الٰہی سے اکتساب کیا لیکن شدتِ عشق کو برداشت نہ کرسکا اور اپنے دل کا ایک

---

[۱] جاوید نامہ از اقبال ص۱۸

حقیقۃ جلا کر سیاہ داغ لے بیٹھا۔ اگر وہ بھی وسیع النظرف ہوتا تو سراپا نور بن جاتا۔

(۲)

کور را بینندہ از دیدار کُن

بولہب را حیدرؑ کرار کُن ؎۱

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نورِ ہدایت ہیں۔ جو شخص صفائی قلب رکھتے ہوئے آنحضور صلعم کے توسل سے معرفتِ الٰہی چاہتا ہے وہ حضرت علی علیہ السلام کی طرح اعلیٰ مراتب پاتا ہے۔ بخلاف اس کے جس شخص کا دل ہی تاریک ہو وہ راہِ حق پہ گامزن نہیں ہو سکتا اور ابولہب کی طرح سے مذموم قرار دے دیا جاتا ہے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ مسلمان کا دل بھی ظلماتی طاقتوں کے زیرِ اثر ہونے کی وجہ سے اندھا ہو گیا ہے لہٰذا اسے چاہیئے کہ معرفتِ رسولؐ سے دل کی جلا کرے تاکہ اسے بصارت نصیب ہو اور وہ گمراہ ہدایت یافتہ ہو جائے۔

(۳)

پیشِ او نہ آسماں نہ خیبر است

ضربتِ او از مقام حیدر است ؎۲

اقبال کے نزدیک مومن بڑی طاقت کا مالک ہوتا ہے وہ حضرت علی علیہ السلام

؎۱ جاوید نامہ صـ۸۳ (حکمت خیر کثیر است) ؎۲ جاوید نامہ صـ۹۸ (فلکِ زہرہ)

کا پیرو ہو کر کائنات کے نو آسمانوں کو تسخیر سمجھتا ہے اور ان ہی کی طرح انھیں تسخیر کر لیتا ہے۔ علامہ کو حضرت علیؑ سے والہانہ عشق ہے۔ آپ انھیں قوت و توانائی کا واحد نمائندہ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معرکے سر کرنے کا جہاں بھی قرینہ پیدا کرتے ہیں ان کا نام نامی ضرور زبان پر لاتے ہیں۔

(۴)

حکمِ حق را در جہاں جاری نکرد
نانے از جَو خورد و کراری نکرد [1]

اقبال مومن کا سب سے بڑا فرض شریعت اسلام کا اجرا قرار دیتے ہیں۔ آپ کے خیال میں رہبانیت فعلِ سود مند نہیں۔ مسلمان کو جہاں خوراک کے معاملے میں حضرت علیؓ کی سنت پر عامل ہوتے ہوئے جَو کی روٹی کھانی چاہیئے وہاں اسے فتوحات کے حصول اور اسلام کی اشاعت میں بھی کارہائے نمایاں سر انجام دینے چاہئیں۔ آج کل کے مسلمانوں نے تصوف کو شعار بنا لیا ہے۔ ان ہی میں کے بعض نے خانقاہیں تعمیر کیں اور ان میں مستقل قیام کر کے یہ سمجھ لیا ہے کہ انھوں نے اسلام کو محکم پکڑا ہوا ہے۔ حالانکہ ان کا خیال غلط ہے۔ وہ جب تک فقرِ علیؓ کے ساتھ کراری میں بھی ان کی سنت پہ عمل نہ کریں گے اور شریعت کو نافذ کرنے کے لیے جد و جہد سے کترائیں گے، کبھی بھی فلاح نہیں پا سکیں گے۔ انھیں چاہیئے کہ جہاں جَو کی روٹی کو خوراک بنائیں وہاں اسلام کے قیام کے

---

[1] جاوید نامہ ص ۱۵۲

لیے جد و جہد بھی کیا کریں۔

(۵)

خانقاہے جست و از خیبر رمید

راہبی ورزید و سلطانی ندید![1]

مسلمان نے فی زمانہ آرام طلبی اختیار کر کے خانقاہ میں اقامت اختیار کر لی ہے اور جد و جہد سے پہلو تہی کرنے لگا ہے۔ اس نے راہبی اختیار کر کے گوشہ نشینی کی عادت ڈال لی ہے، لہذا فقدانِ تگ و تاز کی بنا پر کبھی بھی غلبہ حاصل کر کے حکمران نہ بن سکا۔ اقبال کے نزدیک دینِ اسلام میں رہبانیت کی اجازت نہیں ہے۔ چنانچہ مسلمان نے جد و جہد کو چھوڑ کر فعلِ مذموم ہی کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں وہ ہر جگہ مغلوب، مقہور اور غلام ہے۔ تارکِ عمل ہو کر اس نے اسلامی روح سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ لہذا صرف عبادات سے وہ اللہ تعالیٰ کو خوش نہیں کر سکتا۔ اسے چاہیئے کہ تسبیح و تہلیل اور صوم و صلواۃ کے ساتھ اسلامی شریعت کو رواج دینے کے لیے عملِ پیہم اور جد و جہدِ مسلسل کو اختیار کر کے اپنی زندگی کو کامیاب بنائے۔

(۶)

دینِ او آئینِ او سوداگری است

عنتری اندر لباسِ حیدری است[2]

---

[1] جاوید نامہ ص ۱۵۲ [2] جاوید نامہ ص ۱۷۰ (روحِ ہندوستان نالہ و فریاد می کند)

اقبال ہندوستانی مسلمانوں کی ریاکاری کا ذکر کر رہے ہیں ۔ فرماتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان کا صرف ظاہر ہی مسلمان ہے ورنہ وہ تو دین فروش اور دشمنِ اسلام ہے ۔ درحقیقت اس کا دین اور اصول مالی منفعت کا حصول ہی ہے ۔ آپ ہندوستانی مسلمانوں کے خصوصی ہمدرد ہیں ۔ لہٰذا ان کے عیب کو ظاہر کر کے ان کی اصلاح چاہتے ہیں ۔

(۷)

با وطن پیوست و از خود در گزشت

دل بہ رستم داد و از حیدرؓ گزشت ؎۱

اقبال فرماتے ہیں کہ مسلمان نے رستم سے محبت کا رشتہ استوار کر لیا ہے ۔ اور وطن پرست بن گیا ہے ۔ ایران کا رہنے والا خود کو ایرانی اور عراق کا رہنے والا عراقی سمجھتا ہے ۔ وہ رستم کی طرح اپنے وطن کے پرستار ہیں اور اپنی حقیقت کو بھول چکے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور انھیں حضرت علی علیہ السلام کا تتبع کرنا چاہیئے اور قومیت کی قید سے رہا ہو کر ہر ملک کو اپنا وطن سمجھنا چاہیئے ۔ کہ اس کے خدا کے قبضے میں ہے ۔

---

(۱)

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر ۔۔۔ حریمِ کبریا سے آشنا کر

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے ۔۔۔ اسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر ؎۲

؎۱ جاوید نامہ ص۲۰۲ ؎۲ بالِ جبریل ص ۹

اقبالؒ فرماتے ہیں "یا اللہ! ہم مسلمانوں کو اپنی محبت اور اس پہ استقلال عطا فرما۔ ہمیں اپنی معرفت سے بھی بہرہ ور کر۔ تو ہی نے ہمیں رزق عطا فرمایا ہے، لہذا تو ہی ہمیں طاقت عطا فرما تاکہ ہم تیرے دین کی خدمت سر انجام دے سکیں۔" آپ حضرت علی علیہ السلام کی ذات بابرکات کو جمیع مسلمانوں کے لیے رہنمائے کامل قرار دیتے ہیں۔ بلاشبہ ان کا اسوۂ حسنہ مسلمانوں کے لئے قابلِ تقلید ہے۔ وہ اللہ اور اس کے رسول سے والہانہ محبت کرتے تھے اور اس پہ اپنی جان کی بازی لگانے کی صورت میں بھی قائم تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے جہادِ فی سبیل اللہ میں کبھی اپنی جان کی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ وہ معرفتِ الٰہی کے اس مقام پہ پہنچ چکے تھے کہ فرمایا کرتے تھے "لوکشف الغطاء ما ازددت یقیناً" یعنی اگر میرے اور ذاتِ باری تعالےٰ کے درمیان سے حجاب اٹھا بھی لیا جائے تب بھی میرے یقین میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ انھوں نے نانِ جویں کھا کر اپنا فقر قائم رکھا اور اپنی خداداد قوت سے دینِ حق کا بول بالا کیا۔ پس اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم مسلمانوں کو جہاں ذوقِ [illegible] عطا فرماتا ہے وہاں اثباتِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے قوت بھی عطا فرمائے۔

(۲)

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق — کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر — کبھی مولا علیؓ خیبر شکن عشق [۱]

---

[۱] بال جبریل ص ۲۲

اقبالؒ کا دعویٰ ہے کہ عشق مختلف مقامات پہ الگ الگ اثرات رکھتا ہے۔ کبھی تو وہ پہاڑ کے دامن میں واقع غارِ حرا میں آنحضور صلعم کو بعثتِ نبوت کے لیے تیار کرتا ہے، کبھی انجمنِ پاکبازاں میں تسبیح و تہلیل اور ترتیلِ قرأتِ قرآن سے اصفیا کے دلوں کو سوزِ حیات عطا فرماتا ہے، کبھی آنحضور صلعم کے ساتھ خطبہ و نماز میں کارِ تبلیغِ دینِ اسلام اور عباداتِ الہٰی بجا لاتا ہے اور کبھی معرکۂ حق و باطل میں اثباتِ حق کے لیے حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ باطل کے قلعے کو مسمار کرتا ہے۔ غرضیکہ عشقِ حقیقی ہی اس کائنات کی تہذیب و تزئین اور اصلاح کا باعث ہے۔ تمام انبیاء، اولیا، اصفیا، شہداء اور ائمہ عشقِ حقیقی کی تائید سے ہی اس دنیا کی حقیقی رونق کو دوبالا کرتے ہیں۔

(۳)

دلِ بیدار فاروقی، دلِ بیدار کرّاری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری[1]

اقبالؒ کے نزدیک مسلمان کے دل کو بیدار ہونا چاہیئے۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ معرفتِ الہٰی ہی انسان کے دل کو بیدار کرتی ہے جب کہ انوارِ الہٰی اس کے مصفّٰی قلب پہ عکس ریز ہو کر اسے نورِ ہدایت سے روشن کر دیتے ہیں۔ جب انسان کا دل انوارِ الہٰی سے منوّر ہو جاتا ہے تو وہ انسان کو

---

[1] بالِ جبریل ص ۵۷

خاکی سے نوری عالم میں لے جاتا ہے اور اس طرح اس کی رضا رضائے الٰہی کی تابع ہو کر اسے ہدایت یافتہ بنا دیتی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کا قلب بھی نورِ ہدایت سے منور تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دل بھی اسی نور سے مستنیر قرار پایا تھا۔ حضرت علیؑ اس نور کی تائید سے اس حد تک اسرار و رموز آشنا ہو گئے تھے کہ منبر پہ برملا اعلان فرمایا کرتے تھے "سلونی قبل ان تفقدونی" یعنی مجھ سے جو چاہو پوچھ لو قبل اس کے کہ میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ علامہ موصوف چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے دل بھی بیدار ہو کر معرفتِ الٰہی حاصل کر لیں۔

(۴)

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف[1]

بزار و طبرانی نے اوسط میں جابر بن عبداللہؓ سے اور طبرانی و حاکم و عقیلی و ابن عدی نے ابن عمر سے اور ترمذی و حاکم نے حضرت علیؓ سے مرفوعاً روایت کیا کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا "میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے" اور استیعاب مطبوعہ بر حاشیہ اصابہ جلد ۳ صفحہ ۳۸ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں "قال انا مدینۃ العلم و علی بابھا فمن اراد العلم فلیاتہ من بابہ" یعنی آنحضور صلعم نے فرمایا میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔ جو کوئی

---

[1] بال جبریل ص ۶۱

علم کا ارادہ کرے اس کو چاہیئے کہ دروازے سے آئے اور ترمذی میں حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ "میں دار الحکمت ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے۔" علامہ ابن حجر مکی اور علامہ سیوطی نے حدیث اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا کو بالترتیب حسن و صحیح قرار دیا ہے۔

اقبال نے حدیث کا سیر حاصل مطالعہ کیا تھا۔ اس عمیق مطالعے سے آپ نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ علم کے دو ہی سرچشمے ہیں۔ پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے حضرت علی علیہ السلام۔ آپ اس بات پر یقین کامل رکھتے تھے کہ علم و یقین اور عشق و محبت میں آنحضور صلعم سے استفادہ حضرت علیؑ کے توسل سے ہی ہوا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اس مسلمہ حقیقت کا اقرار کیا ہے کہ خاکِ مدینہ و نجف کو وہ اس لیے عزیز جان کر آنکھوں سے لگاتے ہیں کہ وہاں وہ ستودہ صفات دو ہستیاں آرام فرما رہی ہیں جو علوم معرفتِ الٰہی کی سرچشمہ ہیں۔ آپ نے آنحضور صلعم اور حضرت علی علیہ السلام سے وہ علوم حاصل کیے کہ اہلِ مغرب کی علوم و فنون میں ترقی آپ کے لیے قطعاً کوئی دلکشی نہیں رکھتی تھی۔ یہ فیضِ مدینۂ علم و عطائے بابِ مدینۂ علم ہی ہے کہ آپ علم کے اعلیٰ مدارج طے کر چکے تھے۔

(۵)

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی! [۱]

---

[۱] بال جبریل ص ۸۳

اقبالؒ کے نزدیک حضرت علی علیہ السلام ایک مثالی انسان ہیں۔ آنحضور صلعم کے بعد اگر کسی کو انسان کامل قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ آپ کی ذات بابرکات ہی ہے۔ عشق کے سرمایۂ ایمان، علم کے بابِ مدینہ، حکمت کے بابِ دار، دار القضا کے بہترین قاضی، بہادری میں کرار غیر فرار، شجاعت میں بے مثال، عدالت میں فرد، آیۂ تطہیر کے مصداق، میدانِ مباہلہ کے غازی، تاجدارِ ہل اتیٰ، رضائے الٰہی کے مشتری، ناصر و وزیر رسولِ مقبول صلعم، اسد اللہ الغالب، سیدنا علی المرتضیٰ ہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں آپ سے والہانہ عشق ہے اور آپ کی منقبت میں تمام زندگی رطب اللسان رہے ہیں۔ اس شعر میں وہ اس مردِ درویش کو جو فقر میں حضرت علیؑ کے قائم کیے ہوئے راستے پر چلے دارا و سکندر جیسے شاہانِ باوقار سے بہتر قرار دیتے ہیں۔ دراصل علامہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان فقر کے ہوتے ہوئے بھی خود دار اور بے نیاز رہیں۔ خودداری اور بے نیازی ہی وہ صفات ہیں جو انسان کو بلند مراتب پر فائز کرتی ہیں۔

(۶)

ڈھونڈ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن

اس زمانہ میں کوئی حیدرِ کرار بھی ہے [1]

اقبال ملی اتحاد کے حامی ہیں۔ ان کے نزدیک وطنی بنیادوں پر اتحاد خلفشار و تفرقے کا باعث ہے۔ وہ وطن پرستی کو ترک کرا کے ملی اخوت کی

---

[1] بالِ جبریل ص۹۳

تعلیم دیتے ہیں۔ حالاتِ حاضرہ کے تحت وہ حب الوطنی کے جذبے کو حصارِ باطل قرار دیتے ہوئے خیبر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور مسلمانوں میں سے کسی مردِ میدان کے برآمد ہونے کے منتظر ہیں تاکہ وہ اس خیبر کو حضرت علی علیہ السلام کی طرح فتح کرے اور مسلمانوں کو ملی بنیادوں پہ متحد کرنے میں کامیاب ہو۔

(۷)

یا عقل کی روباہی یا عشقِ ید اللّٰہی
یا حیلۂ افرنگی یا حملۂ ترکانہ[1]

عقل ہمیشہ مصلحت اندیش ہوتی ہے اور کامیابی کے لیے ایسے ذرائع استعمال کرتی ہے جو انسان کو جسمانی تکلیف سے بچائیں، خواہ وہ ناجائز ہی کیوں نہ ہوں۔ بخلاف اس کے وہ عشق جو حضرت علی علیہ السلام کو معشوقِ حقیقی سے تھا۔ جسمانی صدموں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے انجام سے بے پروا ہو کر اپنا کُل سرمایہ حصولِ مقصد کی راہ میں جھونک دیتا ہے۔ اقبال مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ عقل کی روباہی سے اجتناب کر کے حیلۂ افرنگی سے متنفر رہیں۔ ان پہ لازم ہے کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ کے راستے میں اپنا تن، من، دھن قربان کرنے میں بے باکی کا ثبوت دیں۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھ لیں کہ انھوں نے مقصدِ حیات حاصل

---

[1] بالِ جبریل ص۹۵

کرلیا، اور اگر بالفعل ایسا نہ کرسکے تو یقین جانیں زندگی ناکام ہی رہی۔

(۸)

جمالِ عشق و مستی نے نوازی — جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؑ — زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی! [۱]

علامہ اقبالؒ حضرت علی علیہ السلام کو گوہر یک دانہ قرار دیتے ہوئے عشق و مستی کا کمال تصور کرتے ہیں۔ حضرت علیؑ سے عشق و مستی کے جمال کا اظہار ان کے جذبہ اخوت اور ترتیلِ آیاتِ قرآنی سے ہوا۔ ان سے جلالِ عشق و مستی کا قیام غزوات میں جان تک سے بے نیازی کے باعث عمل میں آیا۔ اس طرح وہ جلال و جمالِ عشق و مستی کے جامع ہو کر کمالِ عشق و مستی کے بلند مقام پر جلوہ افروز ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب عمل پیہم کو جب کہ وہ راہِ حق میں ہو رہا ہو کمال احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے امام رازی کی فلسفے کی ترقی کے سلسلے میں محنت اور جد و جہد کو عشق و مستی کا زوال قرار دیا ہے۔ اس رباعی کا نفسِ مضمون یہ ہے کہ رضائے الٰہی کے حصول کے لیے اپنا تمام سرمایہ قربان کرنا عشق و مستی کا کمال ہے اور عمل سے پہلو تہی کر کے فلسفہ بگھارنا اس کا انحطاط ہے۔ آپ مسلمانوں کو مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ مقصدِ حیات کے حصول کے لیے رواں دواں رہیں تاکہ کامیاب و بامراد ہوں۔

---

[۱] بالِ جبریل ص ۱۱۸

(۹)

امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل

نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی[۱]

اقبالؒ کے نزدیک توانائی اور خودداری ہی وہ لازوال نعمتیں ہیں جو انسان کو حقیقی معنوں میں اشرف المخلوقات بناتی ہیں۔ اگر کسی انسان کو ان صفات سے حصہ نہ ملا ہو تو خواہ وہ شہنشاہِ ذوالاقتدار ہی کیوں نہ ہو جائے اس کے لیے قطعاً سودمند نہیں ہے۔ آپ اس زمانے کے مسلمان کو آگاہ کرتے ہیں کہ وہ توانائی اور خودداری کی صفات سے عاری ہے۔ لہٰذا دنیاوی جاہ و حشمت بھی اس کی زندگی کو کامیاب نہیں بنا سکتی۔

(۱۰)

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے

دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے[۲]

علامہ اقبال رحمۃ عشق کے علمبردار ہیں۔ آپ اللہ تبارک و تعالےٰ کے حضور میں دست بدعا ہیں کہ ان کا دل حضرت علی المرتضیٰ کے قلبِ مطمئنہ کی طرح سے انوارِ الٰہی سے روشن ہو اور حضرت ابوبکرؓ جیسی حق کے لیے لگن ان کے دل میں پیدا ہو جائے تاکہ وہ رضائے الٰہی کو حاصل کر کے مقصدِ حیات

---

[۱] بالِ جبریل صہ۱۶۲ (ایک نوجوان کے نام)

[۲] بالِ جبریل صہ۱۶۸ (ساقی نامہ)

کو پا سکیں۔ بلاشبہ ڈاکٹر صاحب کی یہ خواہش اعلیٰ و ارفع ہے اور ایک عبد اپنے معبود سے یہی کچھ مانگ سکتا ہے۔

---

(۱)

قبضے میں یہ تلوار بھی آجائے تو مومن

یا خالدؓ جانباز ہے یا حیدر کرارؓ[۱]

اقبالؒ فقر سے محبت کرتے ہیں۔ آپ کو آنحضور صلعم کا سنہری قول الفقرُ فخرِی خوب یاد ہے۔ آپ بھی آنحضرت صلعم کی سنت میں فقر پر فخر کرتے ہیں۔ آپ کے نزدیک اگر فقر کی تلوار مومن کے ہاتھ میں آجائے تو وہ حضرت علی علیہ السلام کے نقش قدم پہ چلنے کے قابل ہو جائے اور اثبات حق اور ابطال باطل کے لیے نمایاں خدمات سر انجام دے سکے۔ اسی فقر کو اپنا کر وہ حضرت خالدؓ کی طرح فتوحات حاصل کر سکتا ہے غرضیکہ فقر ایمان کے ساتھ ناقابل تسخیر قوت بن جاتا ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ آج کل کے مسلمان بھی ایمان پہ قائم ہو کر فقر کے دامن کو مستحکم پکڑیں تاکہ دنیا میں بھی عزت حاصل کریں اور عقبیٰ میں بھی سرخرو ہوں۔

(۲)

میرے لیے ہے فقط زور حیدری کافی

ترے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک[۲]

---

[۱] ضرب کلیم از اقبال ص ۲۱ (آزادیٔ شمشیر کے اعلان پہ)، [۲] ضرب کلیم ص ۱۲۲ (جلال و جمال)

اقبالؒ حضرت علی علیہ السلام سے ان کے قربِ خدا و رسول کی بنا پر والہانہ محبت کرتے ہیں۔ انھیں آپ کی خداداد قوت سے دلی لگاؤ ہے۔ ان کے نزدیک آپ کی پیروی مقصدِ حیات کے حصول کے لیے لازمی ہے۔ وہ فلسفہ کے چون و چند اور منطق کے صغرےٰ و کبرےٰ کو زندگی کے لیے جزوِ لازم نہیں جانتے۔ لہذا حکیم فلاطون کی فلسفہ طرازی کو ترک کر کے اصلاحی قوت کے طالب ہیں۔

(۳)

خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کراری! ؎۱

اللہ تبارک و تعالےٰ نے اس انسان کو بادشاہوں جیسی شان و شوکت عطا فرمائی ہے کہ جس نے حضرت علی علیہ السلام کے تتبع میں فقر اختیار کر کے اثباتِ حق کے لیے مسلسل جد و جہد کی۔ اقبال مسلمانوں میں فقر کے ساتھ اولوالعزمی اور صلاحیتِ جہاد فی سبیل اللہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ دنیا میں ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے عروج حاصل کریں اور دنیا میں رضائے الٰہی کے حصول کے باعث عقبیٰ میں سرخرو ہوں۔

(۴)

بے جراتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا وہ عشق یداللّٰہی ؎۲

؎۱ ضربِ کلیم ص۱۷۲ ؎۲ ضربِ کلیم ص۱۷۱

اقبالؒ کا تصورِ عشق مثالی ہے۔ اس عشق کی شاہراہ کا سالک مکروفریب، خوشامد و تملق، آہ و زاری، نالہ و بکا، اور ریاکاری سے متنفر ہے۔ وہ وصالِ معشوق کے لیے چالاکی و عیاری کو ناروا جانتا ہے۔ وہ تو حضرت علی علیہ السلام کے نقشِ قدم پر چل کر جراتِ رندانہ کے ساتھ جان کی بازی لگانا اپنا فرضِ اولین سمجھتا ہے۔ علامہ اقبالؒ حضرت علیؓ سے ان کے کمالِ عشق کی بدولت والہانہ محبت کرتے ہیں۔ آپ تو اس عشق کے قائل ہیں کہ ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اور اسی جراتِ رندانہ کی توقع آپ اس زمانے کے مسلمانوں سے بھی کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ وہ بھی عشقِ حقیقی میں اسی جراٰت کا ثبوت دیں اور اثباتِ حق کے لیے اپنی جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کریں۔

---

(۱)

بدہ او را جوانِ پاکبازے | سرورش از شرابِ خانہ سازے
قوی بازوئے او مانندِ حیدرؓ | دل او از دو گیتی بے نیازے ؎[۱]

اقبالؒ رسولِ مقبول صلعم کے حضور میں عرض کرتے ہیں کہ نیک اختر مسلمان نوجوان کو مئے معرفتِ حقیقی عطا ہو تاکہ اس کا سرور اس کے بازو کو حضرت علیؓ

---

[۱] ارمغانِ حجاز از اقبال ص۲۷

جیسی قوت و توانائی عطا کرے اور اس کا دل دنیا و آخرت ہر دو سے بے نیاز ہو جائے۔ وہ ہر کام خالصۃً للہ کرے اور کسی سے بھی اس کا بدلہ نہ چاہے۔ حضرت علی علیہ السّلام کی جرأتِ رندانہ اور قوت کا یہی راز تھا کہ آپ ہر جد و جہد اللہ تعالےٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کیا کرتے تھے۔ آپ کے کاموں میں خواہشِ نفس کا قطعی کوئی دخل نہ ہوتا تھا۔ مولانا روم نے ایک روایت کو نظم کا جامہ پہنایا ہے جس کی رُو سے آپ ایک پہلوان کے سینے پر سے صرف اس وجہ سے اُتر گئے کہ اس نے آپ کے روئے مبارک پر تھوک دیا تھا۔ آپ نے اسے اس لیے قتل نہ کیا کہ کہیں خواہشِ نفس اللہ کی راہ میں شریک نہ ہو جائے، جو محرومیِ ثواب کا باعث ہو۔ اقبال چاہتے ہیں کہ تمام مسلمان آپؑ کے نقشِ قدم پر چلیں تاکہ رضائے الٰہی کا حصول ان کے لیے آسان ہو جائے اور وہ دنیا و آخرت میں کامران و کامگار رہیں۔

(۲)

گلستانے ز خاکِ من بر انگیز ۔۔۔ نمِ چشمم بخونِ لالہ آمیز
اگر شایاں نیم تیغِ علیؓ را ۔۔۔ نگاہے دہ چو شمشیرِ علیؓ تیز[۱]

اقبالؒ سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں عرض کرتے ہیں کہ انھیں وہ نورِ ہدایت عطا ہو کہ ان کی مساعیِ اسلام کی نشاۃ الثانیہ کا باعث

---

[۱] ارمغانِ حجاز ص۷۷

نہیں - نیز انھیں وہ سوز وگداز عشق عطا ہو کہ وہ ہجرِ معشوقِ حقیقی میں خون کے آنسو روئیں - اس تمام جد و جہد اور اشک افشانی سے بھی اگر وہ حضرت علی علیہ السلام جیسا زورِ بازو اور تیغ براں پانے کے قابل نہ ہو سکیں تو کم از کم ان کی نگاہ میں ہی وہ اثر پیدا ہو جائے جو انھیں اثباتِ حق کے فرائض سرانجام دینے کے قابل بنا دے - ڈاکٹر صاحب آنحضور کو سرچشمۂ نورِ ہدایت اور قاسم مئے عشقِ حقیقی قرار دیتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ آپ سے ہی اپنا دلی مقصد بیان کرتے ہوئے عشقِ حقیقی کا سوز وگداز اور نورِ ہدایت کی راحت کے طلبگار ہیں تاکہ عامۃ المسلمین کو راہ ہدایت پہ لے جانے کی کوشش میں کامیاب ہوں -

---

(۱)

مقصدِ محکم بھی ہے کھلی ان کی زباں

یہ تو اک راہ سے تجھ کو بھی پا کہتے ہیں[۱]

کتاب المناقب میں روایت نقل ہے کہ آنحضور صلعم نے فرمایا:

"فَعَلِیٌّ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْهُ - لَحْمُهٗ لَحْمِیْ وَدَمُهٗ دَمِیْ - فَمَنْ اَحَبَّهٗ اَحَبَّنِیْ وَاُحِبُّهٗ وَمَنْ اَبْغَضَهٗ اَبْغَضَنِیْ وَاَبْغَضُهٗ -"[۲]

یعنی علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں - اس کا گوشت میرا گوشت

---

[۱] باقیات اقبال ص۳۵ (فریادِ امت) [۲] تذکرۃ الیعسوب ترجمہ ارشاد القلوب ص۲

ہے - اس کا خون میرا خون ہے جو اس کو دوست رکھتا ہے وہ مجھ کو دوست رکھتا ہے اور میں (بھی) اس کو دوست رکھتا ہوں اور جو علیؑ سے دشمنی رکھتا ہے وہ مجھ سے دشمنی رکھتا ہے اور میں بھی اس کو دشمن سمجھتا ہوں۔" اقبال نے یہ حدیث بھی پڑھی ہے اور بحث و تمحیص میں لوگوں کو شہادتِ عثمانؓ کے سلسلے میں حضرت علی علیہ السّلام کے موقف پر اعتراضات سننے کا بھی موقع ملا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ ایسے لوگ، جو اُمتی ہونے کے دعویدار بھی ہیں اور حضرتِ علی علیہ السّلام پر زبانِ طعن بھی دراز کرتے ہیں درحقیقت وہ آنحضور صلعم کی بُرائی کرتے ہیں اور گناہ کماتے ہیں انھیں جاننا چاہیے کہ حضرت علیؑ آنحضرت صلعم کے وزیر، بھائی، وصی اور محبوب ہیں۔

(۲)

تیرے پیاروں کا جو یہ حال ہوا اے شافعِ حشر

میرے جیسوں کو تو کیا جانیے کیا کہتے ہیں [1]

اقبال اُمت کے افراد کی خوردہ گیری سے نالاں ہیں اور آنحضور صلعم کے حضور ان کے حضرت علیؑ پر بے جا اعتراضات کا شکوہ کرتے ہوئے عرض پرداز ہیں "یا رسول اللہ! تیری اُمت جب تیرے پیاروں پر بی زبانِ طعن دراز کرتی ہے تو مجھ گنہگار کی تو حیثیت ہی کیا ہے سب مجھے نہ معلوم

---

[1] باقیاتِ اقبال ص ۳۴۵ در فریادِ اُمت)

وہ کس قدر موردِ لعن طعن گردانتے ہوں گے۔"

(۳)

فیض اقبال ہے اسی در کا
بندۂ شاہِ لافتا ہوں میں ؎۱

ابو رافع رض سے مروی ہے کہ جب علیؑ ابن ابی طالب نے احد کے دن مشرکین کے علمبرداروں کو قتل کر دیا تو رسول اللہ کی نظر مشرکین کی ایک جماعت پر پڑی۔ آپ نے علیؑ سے کہا "ان پر حملہ کرو" انھوں نے حملہ کر کے اس جماعت کا منتشر کر دیا۔ حضرت جبرئیل علیہ السّلام نے کہا کہ میں آپ دونوں کے ساتھ تیسرا ہوں۔ نیز صحابہ نے یہ آواز سنی لَا فَتیٰ اِلَّا عَلِیٌ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار ؎۲ کسی شاعر نے ہاتفِ غیبی کی اس آواز پر ایک مصرع ایزاد کر کے شعر بنا دیا ہے۔ فرمایا ہے ؎

شاہِ مرداں، شیرِ یزداں، قوتِ پروردگار
لَا فَتیٰ اِلَّا علی لَا سَیْف اِلَّا ذُوالفقار

اقبال حضرت علی علیہ السّلام کو علم و قوت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں، لہذا آپ کی غلامی پر فرحاں و نازاں ہیں۔ وہ اپنے علم کو آپ ہی کا فیض قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ کی غلامی کے دعویدار ہیں۔

؎۱ باقیاتِ اقبال صفحہ ۶۹ (خطِ منظوم)

؎۲ ترجمہ طبری اردو جلد اوّل حصّہ سوم صفحہ ۲۵۳ اور سیرت ابن ہشام صفحہ ۱۰۶۹

(۴)

سینۂ پاکِ علیؓ جن کا امانت دار تھا
اے شہِ ذی جاہ! تو واقف ہے ان اسرار سے ۱؎

اقبال حضرت نظام الدین اولیاؒ کے حضور عرض پرداز ہیں: "اے ذی مرتبت بادشاہ! تو ان رازہائے سربستہ سے واقف ہے جو حضرت علیؓ کے پاک سینے میں محفوظ رہے ہیں۔" ڈاکٹر صاحب آنحضور صلعم کو مدینۂ علم اور حضرت علی علیہ السلام کو بابِ مدینۂ علم سمجھتے ہیں۔ آپ کے نزدیک اسرارِ معرفتِ الہیٰ جو آنحضور صلعم پر ظاہر ہوئے تھے وہی حضرت علیؓ کے سینے میں محفوظ تھے۔ چنانچہ یہی رازہائے سربستہ حضرت علیؓ کی بارگاہ سے صوفیائے عظام اور اولیا کرام کو ان لوگوں کے ظرف کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تقسیم ہوتے رہتے ہیں۔ لہٰذا آپ حضرت نظام الدین اولیا کو بھی ان رموز کا واقف گردانتے ہیں۔

(۵)

بہ ہے اقبال فیضِ یادِ نامِ مرتضیٰ جس سے
نگاہِ فکر میں خلوت سرائے لامکاں تک ہے ۲؎

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ ان کا بلند تخیل جس کی رسائی بارگاہِ الہیٰ تک

۱؎ باقیاتِ اقبال صفحہ ۸۸ (عرض بہ جنابِ حضرت نظام الدین اولیاؒ)
۲؎ باقیاتِ اقبال صفحہ ۱۳۵ (غزل ۱۹۰۲ء)

ہو چکی ہے، وہ حضرت علی علیہ السلام کے نامِ نامی کی یاد کے فیض ہی کا مرہونِ منت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو حضرت علیؑ سے والہانہ عشق تھا اور اسی رابطے سے انہیں معرفتِ الٰہی نصیب ہوئی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ مدحتِ بوتراب میں مدام رطب اللسان رہے ہیں۔

(۶)

کرم کرم کہ غریب الدیار ہے اقبال
مرید پیرِ نجف ہے غلام ہے تیرا ؎۱

اقبال کو حضرت محبوبِ الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہٗ سے بہت عقیدت تھی۔ جب وہ بغرضِ تعلیم علوم و فنون انگلستان کو روانہ ہوتے تو دہلی بھی اترے اور آپ کے مزار پہ حاضری دی۔ اس شعر میں وہ فرماتے ہیں۔ "یا خواجہ! میں مسافر ہوں، آپ کا غلام ہوں اور سب سے بڑی بات یہ کہ حضرت علی علیہ السلام کا مرید ہوں۔ لہٰذا استدعا کرتا ہوں کہ مجھ پر رحم و کرم کی نظر کی جائے تاکہ میں اپنے مقصد میں کامیاب و بامراد وطن کو مراجعت کروں۔"

(۷)

دل میں ہے مجھ بے عمل کے داغِ عشقِ اہلبیت
ڈھونڈتا پھرتا ہے ظلِ دامنِ حیدر مجھے ؎۲

؎۱ باقیاتِ اقبال ص۱۵۷ (التجائے مسافر)

؎۲ باقیاتِ اقبال (عرض بہ جناب حضرت نظام الدین اولیاؒ)

اقبالؒ اہلِ بیت اطہار سے والہانہ محبت رکھتے ہیں۔ آپ کو اپنی محبت پہ ناز ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ وہ بے عمل سہی لیکن اہلِ بیت کی محبت سے اتنی سعادت حاصل کر چکے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام انھیں اپنی پناہ میں لینے کے لیے ان کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اہلِ بیت اطہار کی محبت نعمت غیر مترقبہ ہوتے ہوئے دنیا و عقبیٰ کی فلاح و بہبود کی ضامن بھی ہے۔

سپاسِ جنابِ امیرؑ[1]

(۸)

اے محوِ ثنائے تو زبانہا

اے یوسفِ کاروانِ جانہا[2]

اگر حضرت علی علیہ السلام کے محب کو ہی شیعہ کہا جاتا ہے تو یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ علامہ اقبالؒ سب سے بڑے شیعہ تھے۔ ان کے لیے آپ کی

---

[1] یہ نظم جنوری ۱۹۰۵ء کے مخزن میں شائع ہوئی ہے۔ بقولِ مدیر مخزن یہ نظم درج کر کے وہ ان احباب کے تقاضوں سے سبکدوش ہوتے ہیں جو پروفیسر اقبال صاحب کے فارسی کلام کے لیے اکثر دفعہ اشتیاق ظاہر کیا کرتے تھے۔ فارسی نظمیں عموماً اس رسالے میں درج نہ ہوتی تھیں۔ تاہم احباب کے اصرار سے انھوں نے اسے ہدیۂ ناظرین کیا۔ یہی نظم بااظہارِ عقیدت شیخ صاحب صبح کے وقت پڑھا کرتے تھے۔

[2] باقیاتِ اقبال صـ ۱۰۲

شدت سے آنحضور صلعم سے عشق تھا بالکل اتنے ہی پرجوش اور سرگرم وہ امیر علیہ السلام کے عشق میں نظر آتے ہیں۔ منقبت کا آغاز ہی ان کے جوشِ عشق کو بطریق احسن ظاہر کرتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کی ذاتِ ستودہ صفات اتنی اعلیٰ و ارفع ہے کہ مومنین کی زبانیں آپ کی مدح میں لگی رہتی ہیں۔ سچ پوچھو تو آپ کاروانِ حیات کے لیے گرانقدر سرمایہ ہیں۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کو گرانمایہ چیز سمجھ کر ساتھ لے لیا گیا تھا۔ بالکل اسی طرح آپ کی محبت ہر مومن کے دل میں گھر کیے ہوئے ہے۔ مومنین آپ کی محبت کو سرمایۂ ایمان سمجھتے ہوئے عزیز از جاں قرار دے کر اپنے دلوں میں محفوظ رکھتے ہیں۔

(۹)

اے بابِ مدینۂ محبت

اے نوحِ سفینۂ محبت[1]

اقبال حضرت علی علیہ السلام کو سرمایۂ ایمانِ عشق قرار دیتے ہیں۔ یہاں انھوں نے آنحضور صلعم کو مدینۂ محبت گردانتے ہوئے آپ کو محبت کے شہر کا دروازہ کہا ہے۔ ان کے نزدیک حُبِ محبوبِ حقیقی کا حصول آپ کے ذریعے سے ہی ممکن ہے۔ وہ آپ کو محبت کی کشتی کے ناخدا بھی سمجھتے ہیں اور اس امر پر یقینِ کامل رکھتے ہیں کہ آپ کی اللہ تعالےٰ سے محبت اس قدر پُرخلوص تھی کہ وہ فنا فی

---

[1] باقیاتِ اقبال ص۱۰۲

ہو کر رہ گئی ہے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ آپ کی اسی مثالی محبت سے بہرہ ور ہونے کے لئے کوشاں رہیں۔

(۱۰)

اے ماحیٔ نقشِ باطلِ من

اے فاتحِ خیبرِ دلِ من ؎۱

اقبال حضرت امیر علیہ السلام کو اپنے دل میں ادیانِ باطل کے نقوش کو مٹانے والا اور اس میں ماسوا کی قلعہ بندیوں کا فاتح قرار دیتے ہیں۔ وہ قرآن، حدیث اور اسلامی تاریخ کے دقیق مطالعہ سے اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام ہی وہ توانا و طاقتور شخصیت ہیں جنھوں نے مسلسل جد و جہد اور پیہم جہادِ فی سبیل اللہ سے اثباتِ دینِ حق کا فریضہ بطریقِ احسن سرانجام دیا۔ بلاشبہ آپ قامعِ کفر و طغیان ہیں۔ چنانچہ اگر آپ کی پیروی کی جائے اور آپ کی ذاتِ ستودہ صفات سے رشتۂ محبت جوڑا جائے تو انسان کا دل تمام خواہشاتِ سفلی اور حُبِّ ماسوا سے پاک ہو جائے۔

(۱۱)

اے ستّرِ خطِ وجوب و امکاں

تفسیرِ تو سورہ ہائے قرآں ؎۲

اقبال فرماتے ہیں "یا علی المرتضیٰ"! آپ ذاتِ احدیت و کائنات کے درمیان

؎۱ باقیاتِ اقبال ص۱۰۲ ؎۲ باقیاتِ اقبال ص۱۰۲

رابطہ قائم کرنے والی شاہراہِ مستقیم کی بنیاد ہیں - آپ کا بیان قرآن کریم کی سورتوں کی طرح محکم اور ہدایت دینے والا ہے۔" سچ ہے کہ امیر علیہ السلام قرآنِ ناطق ہیں اور مسلمانوں کے لیے نورِ ہدایت - آپ نے اپنی ذوالفقار سے دین اسلام کو قائم اور ادیانِ باطل کو فنا کیا ہے - آپ کی محبت ایمان کی نشانی اور آپ سے عداوت کفر کی علامت ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہٗ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: "ہم منافقوں کو خدا و رسول کی تکذیب، نماز سے پیچھے رہنے اور حضرت علیؑ کے بغض سے پہچانتے تھے"۔[1]

(۱۲)

اے مذہبِ عشق را نمائے

اے سینۂ تو امینِ رازے[2]

علامہ اقبال کے نزدیک حضرت علی علیہ السلام مذہبِ عشق کے رکنِ اعظم ہیں اور ان کا سینہ اسرارِ الٰہیہ کا محفوظ خزینہ ہے۔ درحقیقت ڈاکٹر صاحب حضرت علی علیہ السلام کے عشقِ خدا و رسول اور خدماتِ اسلامی کی بنا پہ اس قدر معتقد صادق ہیں کہ راہِ ہدایت کے ذرائع میں انہیں آنحضور صلعم اور ان کی ذاتِ ستودہ صفات کے علاوہ کوئی تیسرا دکھائی ہی نہیں دیتا - آپ کو محبت تمام اصحابِ رسول صلعم سے ہے لیکن حضرت علی علیہ السلام سے خصوصی محبت

---

[1] ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء۔

[2] باقیاتِ اقبال ص۱۰۳

تو آنحضور صلعم کی محبت کے ساتھ عشق کی معراج پہ پہنچ گئی ہے۔

(۱۳-۱۶)

اے سرِ نبوتِ محمدؐ   اے وصفِ تو مدحتِ محمدؐ
گردوں کہ بہ رفعت ایستادست   از بام بلندِ تو فتادست
ہر ذرّہ درگہت چو منصور   در جوشِ ترانہ انا المنصور
بے تو نتواں باو رسیدن   بے او نتواں بتو رسیدن [1]

علامہ اقبال حضرت علی علیہ السلام کو آنحضور صلعم کی نبوت کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ تاریخِ اسلام اس امر پہ شاہدِ عادل ہے کہ دعوت ذوالعشیرہ میں علیؑ نے کارِ تبلیغِ نبوت میں نصرت کا اعلان کیا اور آنحضرت صلعم کے وزیر، وارث اور بھائی قرار پائے۔ نبوت کے قیام کے لیے آپ نے ہر غزوہ میں جان کی بازی لگائی اور اپنی قوتِ خداداد سے ادیانِ باطل کی سرکوبی کی۔ اقبال آپ کی منقبت کو نعتِ رسول قرار دیتے ہیں۔ سچ ہے پھل کی تعریف درحقیقت درخت کی ہی خوبی کا بیان ہے۔ آنحضور صلعم شجرِ نورِ ہدایت تھے اور حضرت علی علیہ السلام اس کا پھل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا تھا: میں علم کا شہر ہوں۔ اور حضرت علی اس کا دروازہ ہیں، میں حکمت کا گھر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔ جس کا میں آقا ہوں اس کا یہ علیؑ آقا ہے، علی مجھ سے ہیں اور میں علی سے ہوں، اس کا گوشت میرا گوشت اور اس کا خون میرا خون ہے۔

---

[1] باقیاتِ اقبال ص ۱۰۳

اور جو اس کو دوست رکھتا ہے وہ مجھ کو دوست رکھتا ہے۔" علامہ موصوف کے نزدیک آپ کا دولت کدہ چرخِ بلند سے کہیں زیادہ رفیع ہے۔ آپ کی بارگاہ کا ہر ذرہ انتہائی منور ہونے کی بنا پر سرخوشی و سرمستی میں منصور حلاج کی طرح "انا الطور" کا نعرہ لگاتا ہے۔ سچ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام شمعِ نورِ ہدایت تھے اور آپ کی درگاہ کا ہر ذرہ ان معنوں میں "انا الطور" کا دعویدار ہے کہ آپ کی بارگاہ سے ابطالِ باطل کے سینکڑوں کارہائے نمایاں سرانجام پائے جب کہ طور کی روشنی سے صرف ایک قوم نے ہدایت پائی تھی۔ علامہ نے انہی مطالب کے ساتھ آنحضور صلعم کے لیے بھی فرمایا ہے:

طور موجے از غبارِ خانہ اش

بات دراصل یہ ہے کہ علامہ آنحضور صلعم اور حضرت امیرؑ میں بجز نبوت کے کوئی فرق محسوس نہیں کرتے۔ آنحضرت صلعم نے خود فرمایا ہے "علی تم میرے نزدیک بمنزلہ ہارون کے ہو مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں"۔ وہ اس امر کو مسلمہ حقیقت قرار دیتے ہیں کہ حضرت علیؑ کے ذریعہ ہی آنحضور صلعم تک رسائی ہو سکتی ہے۔ اور آپ تک بھی کوئی نہیں پہنچ سکتا تاآنکہ وہ آنحضرت صلعم پہ ایمان نہ لے آئے۔ ہر انسان کو ایمان لاکر مسلمان ہونا چاہیئے اور مسلمان ہو کر آپ تک رسائی کرنی چاہیئے۔ غرضیکہ آپ کی پہچان اور آنحضرت صلعم کی معرفت لازم و ملزوم ہیں۔

(۱۷ - ۲۳)

فردوس نہ تو چمن در آغوش — از شانِ تو حیرت آئنہ پوش

جانم بغلامیٔ تو خوشتر — سر بر زدہ ام ز جیبِ قنبر

ہشیارم و مستِ بادۂ تو | چوں سایہ زپا فتادۂ تو
از ہوش شدم مگر بہوشم | گوئی کہ نصیریؑ خموشم
دانم کہ ادب بضبطِ راز است | در پردۂ خامشی نیاز است
امّا چہ کنم مئے تولّا | تند است برون فتد ز مینا
ز اندیشۂ عافیت رہیدم
جنس غمِ آل تو خریدم ؎

علامہ اقبال حضرت علی علیہ السلام کے حضور میں عرض کرتے ہیں " یا مولا! آپ فردوس کی زینت بڑھانے والے ہیں۔ آپ کی شان اتنی ارفع ہے کہ حیرت خود تصویرِ حیرت بن گئی ہے۔ میری روح آپ کی غلامی پہ شاداں و فرحاں ہے اور میں آپ کے غلام قنبرؓ کے نورانی دل پہ حیرت زدہ ہوں۔ میں ہوشیار ہوں کہ آپ کی محبت کی شراب سے مست ہو گیا ہوں اور اسی سرمستی میں سایے کی طرح آپ کے نقشِ قدم پہ ساتھ ساتھ چلتا ہوں۔ میں بے خود ہو گیا ہوں لیکن درحقیقت ہوش میں ہی ہوں۔ یہ کہیے کہ آپ کا خاموش فدائی ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ادب کا تقاضا یہی ہے کہ رازِ عشق کو افشا نہ کیا جائے کیونکہ نیازمندی خاموشی میں ہی مضمر ہے۔ لیکن میں کیا کروں کہ آپ کی محبت کا جذبہ ہی بہت شدید ہے اور میں مجبور ہوں کہ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر اظہارِ محبت کر ہی ڈالوں۔ میں نے آپ کی محبت سے از خود رفتہ ہو کر اہلبیت اطہار

؎ باقیاتِ اقبال ص ۱۰۳

کا غم خرید لیا ہے اور اس طرح سے اپنی نجات کے سلسلے میں ہر خوف سے رہائی پا لی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے ان اشعار سے ان کے حضرت علیؑ سے والہانہ عشق کا خوب اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ اللہ اور رسولؐ کے بعد آپ کو ہی بزرگ ترین قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک حضرت علی کی محبت ہی محشر میں ہماری نجات کی ضامن ہے۔

(۴۴ - ۴۲)

فکرم چو بہ جستجو قدم زد | در دیر شد و در حرم زد
در دشت طلب بسے دویدم | داماں چو گرد باد چیدم
در آبلہ خار ہا خلیدہ | صد لالہ تہ قدم دمیدہ
افتادہ گرہ بروئے کارم | شرمندۂ دامن غبارم
پویاں پئے خضر سوئے منزل | بر دوش خیال بستہ محمل
جویائے مے و شکستہ جامے | چوں صبح بیادہ چیدہ دامے
پیچیدہ بخود چو موج دریا | آوارہ چو گرد باد صحرا
وا ماندہ ز درد نارسیدن | در آبلہ شکستہ دامن
عشق تو دلم ربود ناگاہ | از کار گرہ کشود ناگاہ[۱]

علامہ اقبال فرماتے ہیں "میرے فکر نے تلاش معشوق کے لیے جستجو کے

---

[۱] باقیات اقبال ص۱۰۴

میدان میں قدم رکھا۔ چنانچہ کبھی وہ حصولِ مقصد کے لیے مسند میں پہنچا اور کبھی در کعبہ کو جا کھٹکھٹایا۔ میں نے جستجو کے جنگل میں بڑی تگ و دو کی اور بگولے کی طرح سے بیابان کو چھان مارا۔ میرے پاؤں کے آبلوں میں کانٹے چبھ گئے اور خون نے زخموں سے جاری ہو کر زمین پر گلِ لالہ جیسے سُرخ نشان ہر قدم پہ ڈالنے شروع کر دیے۔ لیکن باوجود اس جدوجہد کے میرا مقصد حاصل نہ ہو سکا اور میں سوائے ناکامی کی ندامت کے کچھ بھی حاصل نہ کر سکا۔ میں توسنِ خیال پر چڑھ دوڑا اور رہبر کے پیچھے منزل کی طرف رواں ہوا۔ میں ٹوٹا ہوا پیالہ تھا ہے شراب کی تلاش میں تھا اور میری حالت بالکل ویسی ہی تھی جیسی کہ صبح کی جب کہ وہ نسیم سحری سے بے بہرہ ہو۔ میں نامرادی کی وجہ سے سمندر کی لہر کی طرح مضطرب تھا اور بگولے کی طرح مارا مارا پھر رہا تھا۔ میں آبلوں میں درد کی ناپختگی کی وجہ سے تھک کر ہمت ہار چکا تھا کہ اچانک یا علی المرتضیٰ! آپ کے عشق نے میرے دل کو اُچک لیا اور میرا مقصد بر آیا۔"

علامہ اقبال نے ان اشعار میں حضرت امیر علیہ السلام کی دستگیری سے پہلے طلبِ عشق کے سلسلے میں اپنی تمام تگ و دو اور اسی سلسلے میں انتہائی تکالیف برداشت کرنے کا ذکر کیا ہے۔ نیز یہ بھی بتایا ہے کہ ان مصائب کا اختتام حضرت علیؑ کے عشق کی دلربائی کے ساتھ ہی ہو گیا اور انہیں آسودگی حاصل ہوئی۔

(۳۳-۱۴۱)

آگاہ ز ہستی و عدم ساخت
بت خانۂ عقل را حرم ساخت

چوں برق بخرمنم گزر کرد
از لذتِ سوختن خبر کرد

برباد متاعِ ہستیم داد
جامے ز مئے حقیقتم داد

سرمست شدم ز پا فتادم
چوں عکس ز خود جدا فتادم

پیراہنِ ما و من دریدم
چوں اشک ز چشم خود چکیدم

خاکم بفرازِ عرش بُردی
زاں را کہ با دلم سپردی

واصل بکنار کشتیم شد
طوفانِ جمالِ زشتیم شد

جز عشق حکایتے ندارم
پروائے ملامتے ندارم

از جلوہ علم بے نیازم

سوزم، گریم، تپم، گدازم [۱]

علامہ اقبال فرماتے ہیں "عشقِ علی المرتضیٰ نے جب میری دستگیری کی اور مجھے سرگردانی سے رہائی دلا دی تو مجھے حیات و ممات سے آگاہ کر دیا اور اس طرح میری عقل کے بتکدے کو بتوں سے پاک کر کے حرم محترم بنا دیا۔ وہ بجلی کی طرح میرے سرمایۂ دل سے گزرا اور مجھے سوز و گداز کی لذت سے آشنا کر دیا۔ میری باطل ہستی کو مٹا کر مجھے شرابِ معرفت کا پیالہ نوش جاں کرایا۔ جس کے باعث میں سرمست و

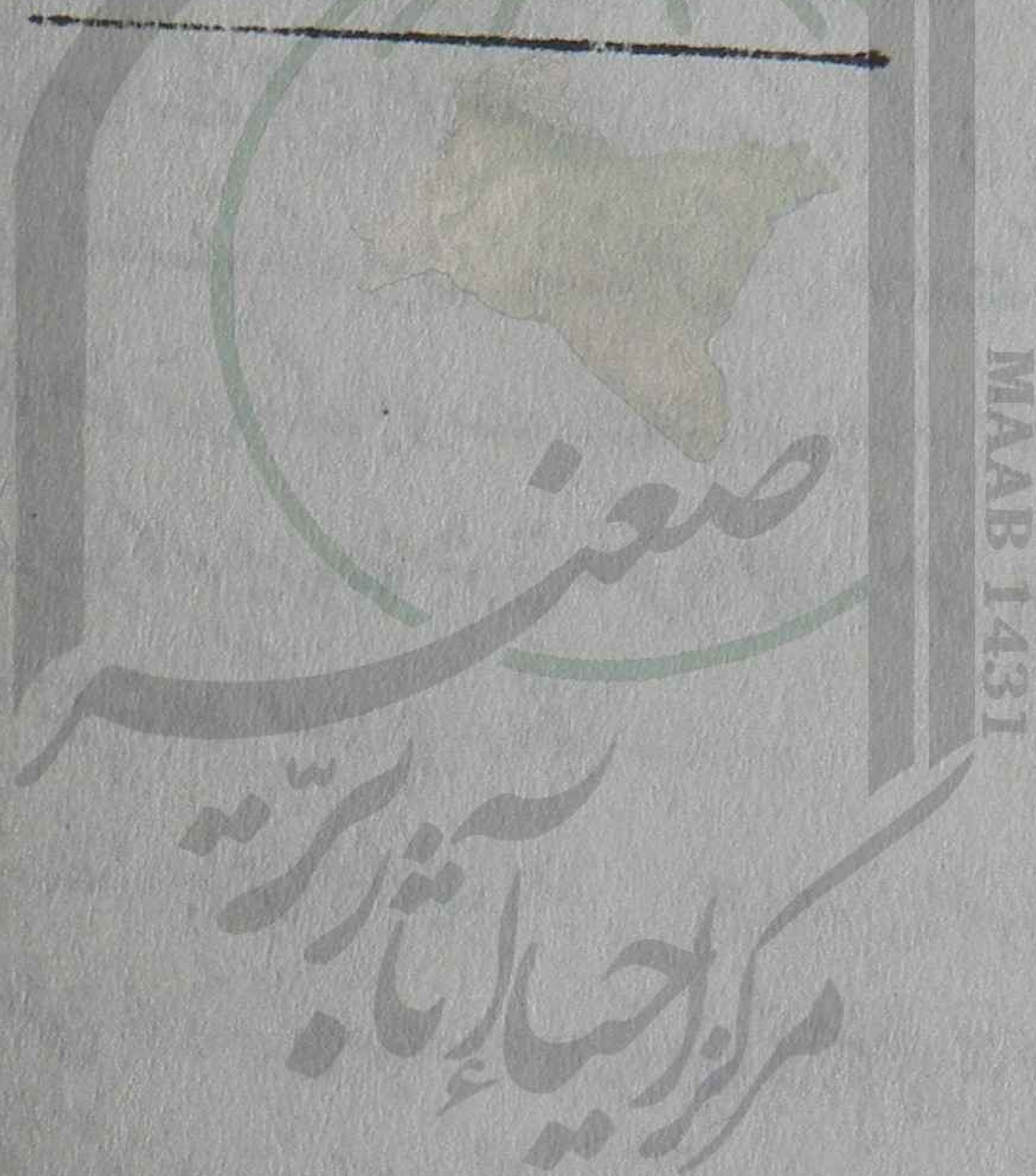
---

[۱] باقیات اقبال صفحہ ۱۰۴-۱۰۵

سرخوش ہو کر لڑکھڑا گیا اور عکس کی طرح سے اپنے آپ سے جدا ہو گیا۔ چنانچہ مدہوش ہو کر میں نے پیراہنِ خودی کو چاک کر ڈالا اور آنسو کی طرح میں اپنی آنکھ سے ٹپک پڑا۔ وہ میری خاک کو عرش کی بلندی تک لے گیا اور اسے میرے دل کے سپرد کر دیا، جس کی بنا پہ میری روح کی کشتی کنارے لگ گئی اور میری برائیاں بھلائیوں میں بدل گئیں۔ اب جب کہ عشق نے مجھے مقصدِ حیات پہ دسترس دلائی ہے اور میرا نجات دہندہ ثابت ہوا ہے میں سوائے عشقِ علی المرتضیٰ کے کوئی کہانی بیان کے لیے نہیں رکھتا اور اس فسانے کے بیان کرنے میں کسی ملامت کی پروا نہیں کرتا۔ میں اب عام معشوقوں کے جلوے سے بے نیاز ہو چکا ہوں اور اب لے دے کے میرا کام میرے معشوقِ خاص (علی المرتضیٰؑ) کے عشق میں جلنا، آہ و زاری کرنا، تڑپنا اور پگھلنا ہی رہ گیا ہے۔

علامہ موصوف نے "سیپارۂ جنابِ امیر" میں جہاں حضرت علی علیہ السلام سے اپنے انتہائی عشق کا ذکر کیا ہے وہاں آپ کی منقبت میں بھی مدح سرائی کی آخری حد تک پہنچ گئے ہیں۔ سچ پوچھیے تو آپ نے اس قصیدے میں تعریفی و توصیفی الفاظ و تراکیب کا ذخیرہ ہی ختم کر دیا ہے، اور مطالب کے بحورِ ذخار کو ایسی خوبی سے کوزوں میں بند کیا ہے کہ مالائے مروارید گرانمایہ کا نقشہ پیشِ نظر ہو جاتا ہے۔ درحقیقت آپ کا یہ نادرِ روزگار اور شاہکار قصیدہ اس مقصد کے لیے ہزارہا ضخیم کتابوں کی تصنیف پہ بھاری ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے حضرت علی علیہ السلام کی منقبت کا حق ادا کر دیا ہے۔ بلاشبہ آپ کو وزیر و وارثِ رسولؐ، زوجِ بتولؑ، پدرِ حسنینؑ، ناصرِ دینِ اسلام، قامعِ ادیانِ باطل، ماحیٔ کفر و طغیان، محیٔ حق و صداقت اسد اللہ الغالب سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام کی مدح سرائی کا ذریعہ ایسے ہی کلامِ بلاغت نظام کو بنانا چاہیے تھا۔



اقبال نقیبِ فاطمہ علیہا السلام

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ
مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ

(اقبالؒ)

علامہ اقبالؒ نے جہاں اسلام ماننے والے تمام مردوں میں مثالی مومن حضرت علی علیہ السلام کو قرار دیا ہے وہاں تمام مومنہ عورتوں میں حضرت فاطمۃ الزہرا کو مثالی مومنہ گردانا ہے۔ جیسے کہ اصحاب النبیؐ سب کے سب قابلِ صد احترام ہیں لیکن مومنین کے لیے اسوۂ کامل علیؑ ہی ہیں۔ بالکل ویسے ہی امہات المومنین جیسی برگزیدہ ہستیاں گوکہ دنیا و آخرت میں تمام مومنین کی مائیں ہیں اور قابلِ صد تعظیم ہیں تاہم ایمان والی عورتوں کے لیے اسوۂ کامل حضرت فاطمہؑ ہی ہیں۔ درحقیقت آپ کے نزدیک جو تعظیم اس جوڑے کی ملحوظِ خاطر ہے وہ دنیا بھر میں کسی دوسرے جوڑے کے لیے کی جانی ہرگز روا نہیں ہے۔ آپ نے یہ خصوصی فضیلت جو اس جوڑے کے لیے ضروری قرار دی اس کا واحد سبب آپ کا وہ مطالعۂ قرآن و حدیث تھا جو آپ نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کے لیے کیا۔ جب آپ نے احادیث میں حضرت فاطمہ کا سیدۃ النساء العالمین ہونا مرقوم پایا، آنحضور صلعم کا فرمان کہ

"اِنَّمَا فَاطِمَۃُ بَضْعَۃٌ مِّنِّیْ" یعنی بے شک فاطمہ میرا پارۂ گوشت ہے
مطالعہ کیا اور اُمّ المومنین عائشہؓ کا یہ قول کہ "رسول اللہ صلعم کو سب سے زیادہ
پیاری حضرت فاطمہ تھیں" اور یہ کہ "میں نے فاطمہ سے بڑھ کر کسی کو سچ بولنے
والا نہ دیکھا۔ ہاں وہی ایسا ہو سکتا ہے جو نبی کا جایا ہو۔" لکھے پائے تو ایک
حقیقت پسند انسان کی طرح ان کی فضیلت کے مُقِر ہو گئے۔ چنانچہ ان کی
اعلیٰ و ارفع ذات، نمایاں صفات، امتیازی خصوصیات اور خدماتِ اسلامی کی
بنا پہ انھیں جمیع اناث کے لیے اسوۂ کاملہ قرار دے دیا۔

آئیے اب ہم آپ کی اس منقبت کے مطالب کا مطالعہ کریں جو آپ
نے حضرت فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا کی شان میں نظم فرمائی ہے۔ جس میں آپ کی ذاتِ
ستودہ صفات کو نساءِ اسلام کے لیے اسوۂ کاملہ ٹھیرایا ہے۔

(۱)

مریمؑ از یک نسبت عیسیٰؑ عزیز
از سہ نسبت حضرتِ زہراؓ عزیز

اقبال فرماتے ہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام کا سب سے بڑا شرف یہ
ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ہیں۔ مسلمان ہوتے ہوئے
حضرت عیسیٰؑ کی فضیلت کا اقرار اور ان کا احترام ہم سب پر فرض ہے۔
یہی فرض ہمیں حضرت مریمؑ کے احترام اور اعزاز پر آمادہ کرتا ہے۔ ان
کے مقابلے میں حضرت فاطمہ علیہا السلام تین واسطوں کے شرف کی وجہ سے
ہمارے نزدیک محترم و معزز ہیں۔

(۲-۳)

نورِ چشمِ رحمۃٌ للعالمین
آں امامِ اوّلین و آخرین
آں کہ جاں در پیکرِ گیتی دمید
روزگارِ تازہ آئیں آفرید

آپ کے شرف کا سب سے پہلا بزرگ واسطہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ رسولِ مقبول، سید البشر، رحمۃ للعالمین اور خاتم النبیین ہونے کے باعث دنیا و آخرت میں امام الانس ہیں۔ وہ تو وہ اعلیٰ و ارفع ذاتِ ستودہ صفات ہیں کہ ان کی منصبِ نبوت پر سرفرازی سے دنیا کے مردہ جسم میں دوبارہ جان پڑ گئی۔ انھوں نے اس دنیا کی تہذیب و تزئین کے لیے محکم اور خوشگوار قوانین و ضوابط ترتیب دیے اور اسے حقیقی معنوں میں جنت الارض کہلانے کا مستحق بنایا۔ چنانچہ آپ خیر البشر کی دخترِ نیک اختر ہونے کی بنا پر احترام اور اعزاز کی مستحق ہیں۔

(۴-۵)

بانوئے آں تاجدارِ ھل اتیٰ
مرتضےٰ، مشکل کشا، شیرِ خدا
پادشاہ و کلبۂ ایوانِ او
یک حسام و یک زرہ سامانِ او

آپ حضرت علی علیہ السلام کی زوجۂ محترمہ ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ

نے اپنے پیارے نبی صلعم کی زبان حقیقت بیان کے واسطے سے آپ کے
محترم اور برگزیدہ شوہر کو مرتضیٰ یعنی پسندیدہ، مشکل کشا یعنی رزم و بزم
کے مسائل کا حلال، اسداللہ یعنی راہِ حق کا واحد بہادر اور تاجدارِ ھل اتی یعنی سورۂ دہر
میں مذکورہ نعمتوں کا مستحق قرار دیا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم حضرت مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہٗ کے گھر میں آئے۔ دیکھا کہ
حضراتِ حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیمار ہیں۔ حضرت محمدؐ نے ان کے ماں باپ
سے فرمایا کہ تم منت مانو کہ خدائے تعالیٰ تمہارے فرزندوں کو صحت بخشے۔
انہوں نے منت مانی کہ ہم تین روزے نذیر خدا رکھیں گے۔ خدائے تعالیٰ نے
نے حضراتِ حسنین کو صحت دی۔ حضرت کے ہاں روٹی پکی۔ روزہ کھولنا چاہا
کہ اتنے میں ایک فقیر نے آکر پکارا کہ اے اہل بیت پیغمبر کے، میں محتاج مسلمان
ہوں۔ مجھے کھانے کو دو۔ خدائے تعالیٰ اس کا بدلہ بہشت میں دے گا۔
حضرت مرتضیٰ علیؑ نے اپنا حصّہ سب کا اسے دے دیا، حضرت فاطمہ نے
بھی اپنا حصّہ اسے دے دیا۔ آپ دونوں نے کچھ نہ کھایا اور فجر کو پھر
روزہ رکھا۔ دوسرے دن شام کو ایک یتیم آیا کہ کچھ اللہ کے لیے دو۔
ان دونوں نے پھر اپنا کھانا اسے دے دیا۔ تیسرے دن پھر روزہ رکھا۔
تیسری شام کو ایک بندھوا چھوٹ آیا۔ آپ دونوں نے پھر کھانا اسے دے
دیا اور بغیر کھائے سو رہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان کی شان میں یہ آیات
نازل فرمائیں:

یُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ه

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝
إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝
إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ۝

(سورۃ الدھر پارہ ۲۹) یعنی

(میرے خاص بندے ایسے ہیں) جو پورا کرتے ہیں منت کو اور ڈرتے ہیں اس دن سے کہ ہے سختی اس دن کی کھلی ہوئی سب کو پہنچے گی اور وہ کھلاتے ہیں خدا تعالےٰ کی محبت میں محتاج کو، یتیم کو، قیدی کو اور کہتے ہیں کہ ہم تم کو خدا تعالےٰ کی خوشی کے لیے کھلاتے ہیں۔ ہم تم سے بدلہ و احسان نہیں چاہتے۔ اس لیے کہ ہم ڈرتے ہیں اپنے پروردگار سے اس دن کے عذاب سے کہ بے حواس کر دے گا[1]

اقبال کے نزدیک حضرت علی علیہ السلام بادشاہ تھے جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ ان کے گھر کی یہ حالت تھی کہ شادی کے وقت اس کا کل اثاثہ ایک تلوار اور ایک زرہ پہ مشتمل تھا۔ ان کے خیال میں یہی وہ دوسرا شرف تھا جو حضرت فاطمہ کو حاصل ہوا اور جس کی بنا پہ وہ معزز و محترم ہیں۔

(۶-۱۰)

مادرِ آں مرکزِ پرکارِ عشق
مادرِ آں کارواں سالارِ عشق

[1] تفسیر موضح القرآن از شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی و تفسیر حسینی (فارسی)

آں یکے شمع شبستانِ حرم
حافظِ جمعیتِ خیرُ الامم
تا نشیند آتشِ پیکار و کیں
پشت پا زد بر سرِ تاج و نگیں
واں دگر مولائے ابرارِ جہاں
قوتِ بازوئے احرارِ جہاں
در نوائے زندگی سوز از حسینؑ
اہلِ حق حریت آموز از حسینؑ

علامہ اقبال حضرت فاطمہؑ کا تیسرا شرف یہ قرار دیتے ہیں کہ وہ حضرت حسن علیہ السلام اور حضرت حسین علیہ السلام کی مادرِ مہربان تھیں۔ حضرت حسن علیہ السلام عشقِ حقیقی کے مرکز اور حضرت حسین علیہ السلام عاشقانِ صادق کے قافلہ سالار تھے۔ پہلے کعبۃ اللہ میں نورِ ہدایت کے قیام کا باعث ہیں۔ جنھوں نے امتِ مسلمہ کے بکھرے ہوئے شیرازے کو یکجا کرنے اور عداوت و جنگ و جدل کی آگ بجھانے کے لیے مسندِ خلافت کو لات مار دی۔ دوسرے صالحین کے آقا اور حریت پسند افراد کے قوتِ بازو ہیں۔ زندگی میں عشق کی جلن اور لگن آپ کی ذاتِ بابرکات سے باقی ہے اور آپ ہی مردانِ حق کو آزادی کا سبق پڑھانے والے ہیں۔

(۱۱)

سیرتِ فرزندہا از امہات
جوہرِ صدق و صفا از امہات

اقبالؒ نے ایک مسلمہ حقیقت کو شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ بلاشبہ بچوں کی تربیت ماں ہی کیا کرتی ہے۔ بچہ کمسنی میں تازہ ہری لکڑی کی طرح سے ہوتا ہے چنانچہ اسے اپنی حسب منشا موڑا جا سکتا ہے۔ بچے کا جوان ہو کر نیک ہونا کلی طور پر اس کی ماں کی محنت اور سیرت پر منحصر ہے۔ جیسے درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح بچوں کی نیکی ماں کی صالحیت پہ دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ حضرات حسنین علیہما السلام کی اعلیٰ وارفع شخصیات اور نیک سیرت اس امر پہ شاہد ہیں کہ ان کی مادرِ مہربان حضرت فاطمۃ الزہراؑ کی ذاتِ ستودہ صفات انتہائی بلند و بالا تھی۔

علامہ صاحب نے مذکورہ گیارہ شعروں میں حضرت فاطمہ صلواۃ اللہ علیہا کی حضرت مریم علیہا السلام پر فضیلت جتلائی ہے۔ آپ کے نزدیک حضرت مریمؑ کو صرف ایک شرف حاصل تھا کہ وہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی والدہ تھیں۔ ان کے مقابلے میں حضرت فاطمہ کو تین شرف ملے تھے۔ ایک شرف یہ کہ وہ آنحضور صلعم کی دختر نیک اختر تھیں، دوسرا یہ کہ وہ علی المرتضٰی کی محبوب زوجہ تھیں اور تیسرا یہ کہ وہ حضرات حسنین علیہما السلام کی مادرِ مہربان تھیں۔ لہذا ایک خصوصیت کے مقابلے میں تین خصوصیات کے باعث حضرت فاطمہ علیہا السلام حضرت مریمؑ پر فضیلت رکھتی ہیں۔

(۱۲)

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؑ
مادراں را اسوۂ کامل بتولؑ

اقبال فرماتے ہیں کہ اطاعت کی کھیتی کا سرمایہ حضرت فاطمہ علیہا السّلام ہی ہیں۔ آپ جب تک اپنے برگزیدہ والدِ گرامی آنحضور صلعم کے ہاں رہیں۔ ان کی مطیع و منقاد رہیں اور اپنی رضا کو ان کی رضا کے حوالے کیے رکھا۔ بعد ازاں جب آپ کی شادی ہو گئی اور آپ حضرت علی علیہ السّلام کے گھر تشریف لائیں تو آپ نے ان کی اطاعت اختیار کر لی اور ان کی خوشنودی کو اپنی رضا سمجھا۔ بیٹی اور بیوی کی حیثیت سے آپ نے وہ مثالی کردار پیش کیا جو مسلمان بچیوں اور عورتوں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ ہے۔ حضرات حسنینؑ کی اعلیٰ تربیت اور ان کا بلند کردار آپ کے گرامی قدر ماں ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ تمام مسلمان ماؤں کے لیے کامل نمونہ ہیں۔ غرضیکہ مسلمانوں کے طبقۂ اناث کی دنیا و عقبیٰ کی فلاح حضرت فاطمہؑ کی سنت پر عمل کرنے میں ہی مضمر ہے۔

(۱۳)

بہرِ محتاجے دلش آں گونہ سوخت

با یہودے چادرِ خود را فروخت

یہاں علامہؒ حضرت فاطمہؑ کی رقیق القلبی اور محتاج نوازی کے ثبوت میں ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں، جس کی رو سے آپ نے ایک ضرورتمند سائل کی ضرورت پوری کرنے کے لیے اپنی چادر ایک یہودی کے ہاں فروخت کرائی اور اسے اپنے دروازے سے خوش و خرم اور بامراد واپس کیا۔ بلاشبہ آپ کا یہ ایثار اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ انسان کو دردِ دل کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے اور ابنائے جنس کی حاجت روائی اس کا فرضِ منصبی ہے۔

(۱۴)

نوری و ہم آتشی فرمانبرش
گم رضائش در رضائے شوہرش

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمہ علیہا السلام کی ذاتِ ستودہ صفات اتنی اعلیٰ و ارفع ہے کہ فرشتے اور جنات ان کے تابع فرمان رہے ہیں۔ وہ اس قدر بلند مرتبے پر فائز ہوتے ہوئے اپنے محترم شوہر سیدنا حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام کی فرمانبردار تھیں۔ ڈاکٹر صاحب مسلمان عورتوں کو بالواسطہ نصیحت فرما رہے ہیں کہ وہ حضرت فاطمہؑ کی سنت پر عمل کریں اور اپنے شوہروں کے احکامات کی بلا چون و چرا تعمیل کیا کریں تاکہ دنیا و عقبیٰ میں کامیاب و سرخرو رہیں۔

(۱۵)

آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گرداں و لب قرآں سرا

حضرت فاطمہؑ نے آنحضور صلعم اور حضرت خدیجہ صلواۃ اللہ علیہا کی گود میں پرورش پائی تھی جو صبر و رضا کے پیکر تھے۔ چنانچہ آپ نے بھی صبر و رضا کی مثال پیش کر دکھائی جو مسلمان عورتوں کے لیے نمونہ قرار پائی۔ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ چکی پیستے پیستے آپ کے مبارک ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے تھے۔ تاہم بے حد تکلیف کے باوجود آپ کے نازک ہاتھ چکی پیستے رہتے اور زبان مبارک پر قرآنی آیات کا ورد جاری رہتا۔ یہاں بھی ڈاکٹر صاحب مسلمان عورتوں کو صبر و رضا

محنتِ شاقہ اور ذکرِ الٰہی کا سبق دے رہے ہیں۔

(۱۶-۱۷)

گریہ ہائے او ز بالیں بے نیازِ
گوہر افشاندے بدامانِ نمازِ
اشکِ او برچید جبریل از زمیں
ہمچو شبنم ریخت بر عرشِ بریں

وہ قائم اللیل تھیں۔ راتوں کو نمازیں پڑھا کرتیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو کر اپنی طاہر آنکھوں سے آنسو بہایا کرتیں۔ ان کے اس طرح بہائے ہوئے آنسو اتنے گراں قدر تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام انھیں زمین سے چُن کر شبنم کے گہر ہائے آبدار کی طرح عرشِ بریں پہ برساتے تھے۔ ان شعروں میں اقبال نے حضرت فاطمہ الزہراؑ کے زہد اور ان کے بارگاہِ ایزدی میں گریہ کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ مسلمان عورتیں بھی نصیحت حاصل کریں اور ان کے اسوۂ حسنہ پہ چل کر فلاح پائیں۔ یہ مثال ان کے لیے لمحۂ فکریہ بھی فراہم کرتی ہے اور وہ یہ کہ خاتم المرسلین کی طاہرہ دخترِ نیک اختر جس ذات ستودہ صفات کی بارگاہ میں یوں گریہ کناں سجدہ ریز رہیں وہ کتنی اعلیٰ و ارفع ہے۔ نیز یہ بھی کہ جب ایسی معصومہ یوں نیازمندی کا اظہار کرے تو انھیں تو اس بارگاہ میں ان سے کہیں زیادہ نیازمندی دکھانی چاہیئے۔

(۱۸-۱۹)

رشتۂ آئینِ حق زنجیر پاست
پاسِ فرمانِ جناب مصطفےٰ ست
ورنہ گردِ تربتش گردیدمے
سجدہ ہا بر خاکِ او پاشیدمے [1]

علامہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی شریعت اور آنحضور صلعم کے حکم یعنی پردے کا احترام ملحوظِ خاطر ہے ورنہ حضرت فاطمہ صلواۃ اللہ علیہا سے عقیدت اور ان کی غلامی کا جذبہ تو انھیں مجبور کر رہا ہے کہ وہ ان کے مزارِ مقدس کا طواف کریں اور اس پر تعظیمی سجدے نچھاور کریں۔

ڈاکٹر صاحب نے ان دو شعروں میں اپنے دل کو کھول کر رکھا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ انتہائی مدحت کا حق ادا کر دیا ہے۔ درحقیقت حضرت فاطمہؑ کی بے حد عقیدت کے جذبے سے مغلوب ہو کر ہی آپ نے ان کے اسوہ کو مسلمان عورتوں کے لیے مثال کے طور پر پیش کیا اور انہی کی پیروی کی تلقین کی۔ آپ کے نزدیک مومن مردوں کو آنحضور صلعم کی سنت پہ چلنے کے لیے حضرت علیؑ، حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ علیہم السلام کی پیروی کرنی چاہیئے اور مومنہ عورتوں کو آنحضرت صلعم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے حضرت فاطمہ علیہا السلام

---

[1] اسرار و رموز (رموزِ بے خودی) صفحہ ۱۷۸-۱۷۷ (در معنی اینکہ سیدۃ النساء، فاطمہ الزہراؑ اسوہ کاملہ البیت برائے نساء اسلام)

کا تتبع کرنا چاہیئے۔ بلاشبہ اقبال انہی پنج تن پاک اور نفوسِ مقدسہ کو خیرالامم کے برگزیدہ اور منتخب افراد سمجھتے تھے اور ان کی مودّت کو اپنی ذات پہ لازم قرار دے لیا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ ان کی محبت کے جذبے کی شدت سے مغلوب ہو کر بعض مقامات پہ وہ مدحت سرائی کی آخری حدود کو بھی پھاند گئے ہیں۔

(۲۰-۲۱)

فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند
چشمِ ہوش از اسوۂ زہرا مبند
تا حسینےؑ شاخِ تو بار آورد
موسمِ پیشیں بگلزار آورد[1]

علامہ اقبال مسلمان عورت سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اسے بارگاہِ ایزدی سے اعلیٰ وارفع جذبے عطا ہوئے ہیں۔ لہٰذا اسے چاہیئے کہ وہ حضرت فاطمہ علیہا السلام کے چلن سے نابلد نہ رہے، بلکہ ان کے اسوۂ حسنہ پہ عمل پیرا ہو، تاکہ حضرت حسین علیہ السلام جیسی بلند پایہ شخصیت کو جنم دے کر نشاۃ الثانیہ کی آمد کا سبب بنے۔ آپ کے نزدیک حضرت فاطمہؑ کی پیروی ہی مسلمان عورت کے لیے نجاتِ اُخروی کی ضامن ہے۔

(۲۲)

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؑ[2]

[1] اسرار و رموز رموزِ بے خودی (خطاب بہ مخدراتِ اسلام) [2] بال جبریل از اقبال ص ۳۸

علامہ اقبال کے نزدیک حضرت ابوذرؓ غفاری کا فقر، حضرت اویسؓ قرنی کی درویشی اور حضرت فاطمۃ الزہراؑ کا پردہ مثالی صفات ہیں۔ چنانچہ وہ موجودہ زمانے کے مذہبی ٹھیکیدار کے متعلق دریافت فرماتے ہیں کہ کیا یہی وہ ذاتِ شریف نہیں ہے جو دین کے محرمات کو بے خوف و خطر توڑ ڈالتا ہے؟ درحقیقت ڈاکٹر صاحب زمانۂ حال کے ریاکار زاہدوں کے مکر و زہد سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان نفس پرست افراد سے بچیں جو تقدس کا لبادہ اوڑھ کر اور مذہب کی آڑ لے کر مقدس اقدار کو بھی اپنے دوزخِ شکم کی بھینٹ چڑھانے کے لیے غرق کر ڈالتے ہیں۔

(۲۳-۲۴)

اگر پندے ز درویشے پذیری — ہزار امت بمیرد تو نہ میری
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر — کہ در آغوش شبیرےؑ بگیری [1]

ڈاکٹر اقبال دخترانِ ملت سے مخاطب ہیں۔ فرماتے ہیں "اے دخترِ ملت! اگر تو مجھ جیسے درویشِ باصفا کی ایک نصیحت قبول کرلے تو وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ ہزار قوموں کے مرنے پر بھی تو نہ مرے گی۔ وہ نصیحت یہ ہے کہ حضرت فاطمہ علیہا السلام کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے تہذیبِ نو کے اثرات سے بچنے کے لیے خانہ نشین رہ، تاکہ تو اپنے آغوش میں حضرت حسین علیہ السلام جیسے کردار کی حامل شخصیت کو گود میں لینے کا شرف حاصل کرے۔"

---

[1] ارمغانِ حجاز از اقبال ص ۱۳۳ (دخترانِ ملت)

اقبال اور مؤلفِ حسن علیہ السلام

آں یکے شمعِ شبستانِ حرم
حافظِ جمعیتِ خیر الامم

(اقبال)

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم نے قرآنِ کریم، احادیثِ نبوی اور تاریخِ اسلام کا بنظرِ تحقیق مطالعہ کیا ہے۔ چنانچہ آپ اس دقیق و عمیق مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے دنیا و آخرت کی فلاح و بہبود اہلِ بیت اطہار کی سنت پر عمل کرنے ہی میں مضمر ہے۔ عشقِ خدا و دینِ حق کے علمبردار آنحضور صلعم ہیں، عشقِ رسول صلعم اور نصرتِ دینِ اسلام کے داعی حضرت علی علیہ السلام ہیں، اطاعتِ شوہر اور فرمانبرداریٔ والدین میں لاثانی حضرت فاطمۃ الزہرا علیہا السلام ہیں، جاہ و جلال کی حکومت سے بے نیاز اور اتحادِ بین المسلمین کے عملی مبلغ حضرت حسن علیہ السلام ہیں اور شریعتِ اسلام کے اصولوں کی حفاظت کے لیے تن، من، دھن اور ذریت کو قربان کرنے والے حضرت حسین علیہ السلام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے ان نفوسِ مقدسہ اور افرادِ مطہرہ کی پیروی کو عامۃ المسلمین پر فرض قرار دے دیا ہے۔ آپ

کو حضرت حسنؓ سے انتہائی انسیت اور بے حد الفت ہے۔ اس الفت کا واحد سبب ہے اور وہ یہ کہ حضرت حسنؓ نے خلافت سے دستبرداری دے کر مسلمانوں کو آپس کی خونریزی سے بچا لیا۔ بخاری شریف میں آنحضور صلعم کی ایک پیش گوئی مرقوم ہے۔ حدیث مندرجہ ذیل ہے:

عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی الْمِنْبَرِ وَالْحَسَنُ بْنُ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا اِلٰی جَنْبِہٖ وَھُوَ یُقْبِلُ عَلَی النَّاسِ مَرَّۃً وَّعَلَیْہِ اُخْرٰی وَیَقُوْلُ اِنَّ ابْنِیْ ھٰذَا سَیِّدٌ وَّلَعَلَّ اللّٰہَ اَنْ یُّصْلِحَ بِہٖ بَیْنَ فِئَتَیْنِ عَظِیْمَتَیْنِ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ (کتاب الصلح)

(ترجمہ)

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو (ایک مرتبہ) منبر پہ دیکھا جب کہ حسنؓ بن علیؓ آپ کے پہلو میں تھے۔ آپ کبھی لوگوں کی طرف اور کبھی ان کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور فرماتے "میرا یہ بیٹا سید ہے اور امید ہے کہ اللہ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرا دے گا۔"

آنحضور صلعم کی یہ پیش گوئی من و عن پوری ہوئی۔ حضرت حسنؓ نے جب دیکھا

کہ مسلمانوں میں باہمی خونریزی روز افزوں ترقی پر ہے تو آپ نے مسندِ خلافت کو چھوڑ دیا اور مجمع عام میں اعلان فرمایا:

"امابعد، لوگو! خدا نے ہمارے اگلوں سے تمہاری ہدایت اور پچھلوں سے تمہاری خونریزی کرائی۔ دانائیوں میں سب سے بڑی دانائی تقویٰ اور عجز میں سب سے بڑا عجز بد اعمالیاں ہیں۔ یہ امر (خلافت) ہمارے اور معاویہ کے درمیان متنازعہ فیہ ہے۔ یا وہ اس کے واقعی حقدار ہیں یا میں ہوں۔ دونوں صورتوں میں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی اصلاح اور تم لوگوں کی خونریزی سے بچنے کے لیے اس سے دستبردار ہوتا ہوں۔"[۱]

گو کہ آپ نے حضرت حسنؓ کی مدحت کے لیے کوئی مخصوص عنوان قائم نہیں کیا تاہم وہی تین شعر جو زیرِ عنوان "در معنیٔ اینکہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؓ اسوۂ کاملہ ایست برائے نساء اسلام" رموزِ بیخودی میں منقول ہیں آپ کو حضرت حسنؓ کا مداح ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

(۱)

مادرِ آں مرکزِ پرکارِ عشق
مادرِ آں کارواں سالارِ عشق

اقبالؒ کے نزدیک حضرت حسن علیہ السلام پرکارِ عشق کے مرکز ہیں یعنی امام حسنؑ

---

[۱] تاریخ اسلام حصہ اول مصنفہ شاہ معین الدین ندوی ص ۳۸۵ بحوالہ استیعاب و اسد الغابہ۔

وہ اعلیٰ اور ارفع ہستی ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی محبت کو ماسوا کی محبت پر ترجیح دی۔ حکومت کی خواہش ہر انسان کے لئے دلفریب اور مسحور کن ہے۔ عوام سے قطع نظر خواص بھی اس کے خواہاں رہے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جلیل القدر صحابی اور متمول شخصیت ہونے کے باوجود خلافت سے دستبرداری کا مطالبہ کرنے والوں سے حتمی طور پر کہا تھا " خدا نے جو خلعت پہنایا ہے اسے میں اپنے ہاتھوں سے نہ اتاروں گا۔ میں سر دے دوں گا لیکن خدا کی بخشی ہوئی خلافت کو نہ چھوڑوں گا۔"[۱] یہ حضرت حسنؑ کی شانِ استغنا ہی تھی کہ انھوں نے اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم کے احترام میں کہ مسلمانوں کے متحارب گروہوں میں صلح کرا دیا کرو مسلمانوں میں خونریزی اور جنگ و جدل کو بند کرا کے ان میں اتحاد کے لیے کوشش کی۔ چنانچہ آپ کی یہی ادا اقبال کو بھا گئی اور انھوں نے آپ کو مرکزِ پرکارِ عشق قرار دیا۔

(۲)

آں یکے شمعِ شبستانِ حرم
حافظِ جمعیتِ خیر الامم

اقبالؒ حضرت حسن علیہ السلام کو شمعِ شبستانِ حرم قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک آپ نے مسلمانوں سے خونریزی دور کر کے کعبۃ اللہ کی رونق کو دوبالا کیا ہے۔ اور اسے ظلمتِ نفاق سے اسی طرح بچایا ہے جیسے شمع کی

---

[۱] تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین احمد ندوی بحوالہ طبری و ابن اثیر

روشنی کمرے کی ظلمت کو دور کر کے اس کی شان کو بڑھاتی ہے - آپ نے ہی مسلمانوں کی آپس کی دشمنی کو ختم کرنے کی کوشش میں حکومت جیسی متاعِ گرانمایہ کو چھوڑا اور اُمتِ مسلمہ کہ تمام اُمتوں میں بہتر قرار دی گئی ہے کو اشتقاق و نفاق سے بچا کر اس کے اتحاد کی حفاظت کی - آپ کی خلافت سے دستبرداری نے ہی مسلمانوں کو خونریزی اور جنگ وجدل سے بچایا -

(۳۱)

تا نشیند آتشِ پیکار و کیں

پشت پا زد بر سرِ تاج و نگیں [1]

اقبال فرماتے ہیں کہ حضرت حسن علیہ السّلام نے مسندِ خلافت سے دستبرداری دے کر تاج و نگیں کو اس لیے ٹھکرا دیا تاکہ عداوت اور جنگ و جدل کی آگ سے اُمتِ مسلمہ محفوظ و مامون رہے - تاریخ اسلام شاہد ہے کہ آپ نے خلافت کو چھوڑ کر مسلمانوں کو متحد کرنے کے لیے وہ کارنامہ سرانجام دیا ہے جو تا قیامت یادگار رہے گا - اقبال چاہتے ہیں کہ مسلمانانِ عالم بھی حضرت حسن علیہ السّلام کی پیروی کیا کریں اور نفسانی خواہشات کو اُمتِ مسلمہ کے مفاد کے لیے قربان کرتے رہیں تاکہ عداوت و نفاق کا انقطاع و قلع قمع ہو اور اخوت و اتحاد کی فضا قائم ہو، جو عامۃ المسلمین کی دنیاوی و اُخروی فلاح و بہبود کا سبب بنے -

---

[1] اسرار و رموز از اقبال ص ۱۷۷

(۱)

واسطہ دوں گا اگر لختِ دلِ زہرا کا میں
غم میں کیوں کر چھوڑ دیں گے شافعِ محشر مجھے [ا]

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اگر وہ حضرت فاطمہ صلواۃ اللہ علیہا کے لختِ جگر اور فرزندِ دلبند حضرت حسن علیہ السلام کا واسطہ دے کر حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد کی درخواست کریں گے تو انھیں یقین ہے کہ خاتم المرسلین علیہ السلام ان کی ضرور بالضرور مدد فرمائیں گے۔

تاریخ و احادیثِ صحیحہ اس امر پہ شاہد ہیں کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن علیہ السلام سے بے حد محبت فرماتے تھے۔ چنانچہ فرمایا ہے "الٰہی میں اس کو (حسن بن علی) کو چاہتا ہوں تو بھی اس کو چاہ اور اس کو چاہ جو اس کو چاہے" اقبال آنحضرت صلعم کی اس محبت کو خوب جانتے ہیں لہٰذا ان ہی کا واسطہ دے کر مدد کے طالب ہیں۔

[ا] باقیاتِ اقبال ص۲۴

اقبالؔ، مدّاحِ حضرت حسین علیہ السّلام

زندہ حق از قوتِ شبیری است
باطل آخر داغِ حسرت میری است

(اقبالؔ)

علامہ اقبالؒ جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام کے عشق کا اظہار فرماتے رہے ہیں وہاں سیدنا حضرت امام حسین علیہ السّلام سے بھی والہانہ عشق کے دعویدار ہیں۔ وہ آپ کی حیاتِ طیبہ کو زندگی کی معراج قرار دیتے ہیں۔ دشتِ کربلا میں اثباتِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے آپ کی نشو و نما جنگ اور قربانی مردانِ حق کے واسطے تاقیامت مشعلِ راہ ہے۔ انہیں امام عالی مقام کی ذاتِ ستودہ صفات سے بے پناہ محبت تھی۔ چنانچہ انھوں نے اسی محبت کی شدت سے مجبور ہو کر اکثر و بیشتر اپنی وارفتگی کا اظہار بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو سعیٔ پیہم، طلبِ صادق، اخلاصِ عمل، عشقِ حقیقی اور بے لوث قربانی جیسی اعلیٰ اقدار سے خاص لگاؤ رہا ہے۔ لہذا ان خصوصیات سے مزین ذات ان کے لیے قابلِ صد ستائش ہے۔ انھوں نے ان تمام قدروں کو آپ کی شخصیت میں بطریقِ احسن نمایاں پایا۔ چنانچہ

آپ کے عشق کو سرمایۂ حیات قرار دے کر عقیدت کے وہ پھول نچھاور کیے جو رہتی دنیا تک تازہ و خوشبودار رہیں گے

آئیے اب ہم علامہ موصوف کے کلام سے ان کی آپ سے انتہائی محبت کا اندازہ لگانے کی کوشش کریں۔ وہ فرماتے ہیں :

(۱)

ہر کہ پیماں با ہو الموجود بست
گردنش از بندِ ہر معبود رست

ہر وہ انسان جس نے اللہ تبارک و تعالےٰ سے کہ حاضر و ناظر ہے عہدِ وفا باندھا۔ یقین جانیے کہ وہ ماسوا کی قید سے نجات پا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بالکل درست فرمایا ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ انسان جب توحید پر ایمان لا کر خدائے لاشریک کے فرمان پر، کہ آنحضور صلعم کے توسط سے اس تک پہنچا، گامزن ہو، تو وہ غیر اللہ کے تعلق سے چھوٹ جاتا ہے۔ وہ اپنی رضا رضائے الہٰی کے سپرد کر دیتا ہے اور اپنے معبود حقیقی اور معشوقِ لم یزل کی خوشنودی کے لیے اپنا تن، من، دھن بلا تامل قربان کر ڈالتا ہے۔ رضائے الہٰی کا حصول ہی اس کی آخری خواہش ہوتی ہے جسے وہ ہر امکانی کوشش اور قربانی سے حاصل کر لیتا ہے۔

(۲)

مومن از عشق است و عشق از مومن است
عشق را ناممکنِ ما ممکن است

بلاشبہ مومن اسی وقت تک مومن ہے جب تک کہ وہ عشقِ الٰہی کو دل میں جگہ دیے ہوئے ہے۔ بالکل اسی طرح عشقِ معشوقِ حقیقی کے قرار کی منزل بھی دلِ مومن ہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مومن اور عشقِ خدا لازم و ملزوم ہیں۔ بلا عشقِ مالکِ حقیقی سے دل کو روشن کیے انسان کبھی مومن نہیں بن سکتا۔ اسی طرح عشقِ مالکِ حقیقی سوائے مومن کے کسی دوسرے انسان کے دل میں جاگزیں نہیں ہو سکتا۔ مومن کی ہستی نہ عشق سے خالی رہ سکتی ہے اور نہ ہی عشق مومن کا ساتھ چھوڑ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مردِ مومن کی دعا سے تقدیریں تک بدل جاتی ہیں جو عام لوگوں کے لیے ناممکنات سے ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ عشق کے لیے ہر وہ چیز ممکنات سے ہے جو ہمارے لیے ناممکنات ہوا کرتی ہیں۔ مومن کائنات کا مالک ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کا عشق اسے وہ طاقتیں عطا کرتا ہے جن سے عام انسان یکسر عاری ہوتے ہیں۔ سعدی شیرازیؒ نے کیا خوب کہا ہے ؎

تو ہم گردن از حکمِ داور مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکمِ تو ہیچ

جب انسان اپنی رضا کو اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کے حوالے کر دیتا ہے تو دنیا کی تمام طاقتیں اس کے لیے مسخر کر دی جاتی ہیں اور وہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔

(۳ ۔ ۷)

عقل سفاک است و او سفاک تر　　پاک تر، چالاک تر، بیباک تر

عقل در پیچاکِ اسباب و علل　　　عشق چوگان بازِ میدانِ عمل

عشق صید از زورِ بازو افگند　　　عقل مکار است و دامے می زند

عقل را سرمایہ از بیم و شک است　　　عشق را عزم و یقیں لاینفک است

آں کند تعمیر تا ویراں کند　　　ایں کند ویراں کہ آباداں کند

بلاشبہ عقل فصیح و بلیغ ہے لیکن عشق اس سے زیادہ فصیح و بلیغ ہے۔ درحقیقت وہ عقل سے زیادہ خالص، چاق و چوبند اور نڈر ہے۔ اقبال نے اس شعر میں ایک بہت بڑی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔ اہل علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ عشق کا تعلق دل سے ہے اور عقل کا تعلق دماغ سے ہے۔ کارگاہِ دماغ میں ترتیب دیے ہوئے خطبے بنی نوعِ انسان پہ وہ اثر نہیں کر سکتے جو گوشۂ دل سے نکلے ہوئے فقرات اثر کر جاتے ہیں۔ عاقل کی متانت، سنجیدگی اور پرکاری پہ عاشق کی سرجوشی، تندی اور سادگی ہمیشہ غالب آتی ہے۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ انبیاء و ائمہ علیہم السّلام کے خطبات نے انسانوں پہ جتنا اثر کیا اور انہیں جس قدر فائدہ پہنچایا دنیا کے فلسفہ دانوں، سیاست دانوں، سائنس دانوں اور عالموں نے اس کا عشر عشیر فیض بھی نہ پہنچایا۔ غرضیکہ پاکی، تیزی اور تندی میں عشق کو عقل پہ مسلّمہ فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس کی یہی فوقیت عقل کو ہمیشہ زیر کیے رہتی ہے۔ علاّمہ کا یہ فیصلہ سچا ہے کہ عقل تو مکر و زور، حزم و احتیاط اور چھان بین میں ہی گرفتار رہتی ہے۔ بخلاف اس کے عشق میدانِ عمل میں بے خوف و خطر کود پڑنے میں کبھی تامل نہیں کرتا۔ آپ نے

اسی مضمون کو اپنے ایک اور شعر میں ادا کیا ہے فرماتے ہیں ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

سچ ہے عاقل خطرات کو مدِ نظر رکھنے اور اسباب وعلل کے تدارک میں مصروف ہو جانے کی وجہ سے کارہائے نمایاں سر انجام نہیں دے سکتا۔ اس کے مقابلے میں عاشق اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے جرأت و بیباکی کو کام میں لاتا ہے اور خطرات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی جان تک کو بازی پہ لگا کر کامیاب و کامران ہوتا ہے۔ عاشق اپنی ذاتی قوت کو جو عشق سے حاصل کی ہوئی ہوتی ہے بروئے کار لا کر اپنا مقصد پا لیتا ہے اور عاقل اپنی عقل کی رہنمائی میں مکر و زور اور چالاکی و عیاری کے پھندوں سے کام لے کر اپنا مطلب حاصل کرتا ہے۔ مقصد دونوں پا لیتے ہیں گو کہ مختلف ذرائع استعمال کرتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ عاشق کے ذرائع پاک و صاف ہوتے ہیں اور عاقل عیاری کی ناپاکی اور مکر و فریب کی گندگی سے ملوث ہوتا ہے۔ عقل عاقل کو خوف و شک مہیا کرتی ہے لیکن عشق عاشق کو غیر متزلزل ارادے اور محکم ایمان سے نوازتا ہے۔ اہلِ عقل حضرات کی تعمیر میں تخریب نہاں ہے اور اہلِ دل حضرات کی تخریب میں تعمیر چھپی ہوئی ہے۔ سادہ الفاظ میں یوں کہیے کہ سائنس نے جو آسائشیں مہیا کی ہیں وہ چند روزہ ہیں۔ یہی سائنس آلاتِ حرب کی ایجاد سے ان آسائشوں کو کرب و بے اطمینانی میں بدل دیتی ہے۔ اور دنیا والوں کو خسرانِ دنیا و عقبیٰ

سے نوازتی ہے۔ اس کے مقابلے میں دینِ اسلام انسانوں کو چند روزہ پابندیوں میں مبتلا کرکے دنیا و عقبیٰ کی لافانی فلاح و بہبود عطا کرتا ہے۔ علامہ صاحب نے ان اشعار میں عشق و عقل کا مقابلہ کرکے عشق کی فضیلت و برتری ثابت کر دکھائی ہے۔ ان کے نزدیک عشق انسان کو چند روزہ تکالیف میں ڈال کر دوامی آسائش و سکون سے نوازتا ہے۔ جبکہ عقل اسے عارضی آسائش کے بدلے دوامی کرب و بے اطمینانی عطا کرتی ہے۔ لہٰذا یہ امر مسلّمہ حقیقت قرار پاگیا ہے کہ عشق دنیا والوں کے لیے فیض رساں اور عقل مضرت رساں ہے۔ پس انسان پر لازم ہے کہ وہ عشق کو اپنائے تاکہ اس کی برکات سے مستفیض ہو اور عقلِ مکار سے احتراز کرے تاکہ اس کی مضرتوں سے مصئون و مامون رہے۔

(۸-۱۴)

عقل چوں باد است ارزاں در جہاں | عشق کمیاب و بہائے او گراں
عقل محکم از اساسِ چون و چند | عشق عریاں از لباسِ چون و چند
عقل می گوید کہ خود را پیش کن | عشق گوید امتحانِ خویش کن
عقل با غیر آشنا از اکتساب | عشق از فضل است با خود در حساب
عقل گوید شاد شو آباد شو | عشق گوید بندہ شو آزاد شو
عشق را آرام جاں حریّت است | ناقہ اش را ساربان حریّت است
آں شنیدستی کہ ہنگامِ نبرد | عشق با عقلِ ہوس پیشہ چہ کرد

علامہ اقبال عشق کے فیضان اور عقل کی مضرت کے بیان کے بعد دوبارہ

عقل وعشق کا موازنہ شروع کر دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ عقل ہوا کی طرح عام اور سستی ہے لیکن اس کے مقابلے میں عشق نادر اور گرانقدر ہے۔ عقل اسباب و علل کی بنیاد پر قائم ہے جب کہ عشق اسباب و علل سے بے بہرہ ہے۔ عقل ہمیشہ آشکار ہونا چاہتی ہے اور ظاہر پسند ہے لیکن عشق اظہار سے گریزاں اپنے کمال کی آزمائش میں معروف عمل رہتا ہے۔ عقل خود کو ماسوا سے کسب فیض کر کے مستحکم کرتی ہے جب کہ عشق اللہ تعالیٰ کے فضل کا محتاج اور ہر لحظہ خود کو کسوٹی پہ کسنے والا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ عقل کوشش سے حاصل ہوتی ہے اور عشق کی سعادت بزور بازو نصیب نہیں ہوتی بلکہ سراسر موہبت ربانی ہے۔ عقل خوش و خرم رہنے کا مشورہ دیتی ہے بخلاف اس کے عشق مالک حقیقی کے غلام ہو کر ماسوا سے آزاد ہونے کے لیے کہتا ہے۔ عشق کو آزادی ہی سے سکون ملتا ہے چنانچہ اس کے ناقہ کے لیے آزادی ہی ساربان ہے۔ عقل وعشق کے اس مقابلے کے بعد آپ انسان سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ کیا اس نے نہیں سنا کہ حرص و ہوا میں پلنے بڑھنے والی عقل کے ساتھ عشق نے جنگ آزما ہو کر میدان کربلا میں کیا سلوک روا رکھا؟

ڈاکٹر صاحب نے پہلے شعر میں حضرت حسین علیہ السلام کو مالکِ حقیقی کا عاشق قرار دیا ہے۔ جنھوں نے باری تعالیٰ سے پیمانِ وفا باندھا اور ماسوا کی قید سے رہائی حاصل کر لی۔ وہ ہی عاشقِ خدا تھے اور عشق کو انہی سے یہ شرف حاصل ہوا کہ بنی نوعِ انسان کے لیے جو امورِ ناممکنات

قرار پا چکے تھے وہ اس کے لیے ممکن اور آسان قرار دے دیے گئے۔ آپ نے تبسرے شعر سے عقل اور عشق کا موازنہ و مقابلہ شروع کیا۔ آپ کے نزدیک عقل باطل کی نمائندہ ہے اور عشق حق و راستی کا علمبردار۔ باطل ظلم و جور، مکرو زور، چالاکی و عیاری اور پرکاری و ریاکاری کے ہتھیار لے کر حق کے خلاف جنگ آزما ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اسے تباہ و برباد کر دے۔ چنانچہ حق اپنی حفاظت کے لیے رحم و کرم، حق گوئی و بے باکی، عزم و یقین اور جذبۂ آزادی کے ہتھیار اس کے خلاف کام میں لاتا ہے۔ اور بظاہر شکست کھاتے ہوئے بھی حقیقی اور آخری فتح حاصل کر لیتا ہے۔

درحقیقت ان شعروں میں آخری شعر سے پہلے کے تمام اشعار حضرت حسین علیہ السّلام کی مدح میں قصیدے کی تشبیب سے متعلق ہیں۔ علامہ صاحب نے اس بلند پایہ تشبیب کے بعد بڑے استادانہ اور نادر طریق پہ گریز کا ایک شعر (آں شنیدستی کہ ہنگام نبرد - عشق با عقلِ ہوس پرور چہ کرد) کہہ کر مدح و منقبت کی طرح ڈال دی ہے۔

(۱۵)

آں امامِ عاشقاں پورِ بتولؑ

سروِ آزادے ز بستانِ رسولؐ

ماقبل شعر سے گریز کا کام لیتے ہوئے علامہ صاحب اس شعر سے حضرت امام حسین علیہ السّلام کی مدح کا آغاز کر رہے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"وہ (حسینؑ) عاشقانِ مالکِ حقیقی کے امام حضرت
فاطمہ علیہا السلام کے پیارے بیٹے اور محمد صلی اللہ
علیہ وسلم کے باغ کے آزاد سرو ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے درست فرمایا۔ بلاشبہ حضرت حسین علیہ السلام اللہ تعالےٰ سے عشق کرنے والوں کے امام ہیں۔ انھوں نے کربلا کے میدان میں اپنے اصحاب وانصار اور خاندان والوں یہاں تک کہ نوخیز لڑکوں تک کو اللہ تعالےٰ کی راہ میں شہید کرا کے اپنی جانِ عزیز کی بھی قربانی دے دی۔ یہ سب حضرت فاطمہ علیہا السلام کے پاک دودھ اور نبیؐ و علیؑ کی تربیت کا اثر تھا کہ آپ نے اپنا سب کچھ لٹا کر دینِ اسلام کے اصولوں اور آنحضرت صلعم کی عزت و حرمت کو بچا لیا۔ اگر آپ خدانخواستہ باطل کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے تو کہنے والے کہہ سکتے تھے کہ گو ہر و تربیت میں قدرے خامی تھی۔ جبھی تو حضرت حسینؑ قربانی پیش نہ کر سکے۔ مگر انھوں نے اپنی جان قربان کر کے اللہ تعالیٰ کی حقانیت، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور دینِ اسلام کی صداقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ بے شک انھوں نے وہی کیا جو فرزندِ رسول ہونے کی حیثیت سے ان پر بطور فرض عائد ہوا تھا۔

(۱۶)

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنیٔ ذبحِ عظیم آمد پسر

حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا ہے:

فَاعْلَمْ اَنَّ ھٰذَا الْکِتَابَ الْمُنَزَّلَ عَلَی الْاِنْسَانِ

پس معلوم کر کہ واسطے کتاب کے جو نازل کی گئی ہے اوپر انسان

الْکَامِلِ فَاتِحَۃٌ مُسَمّیً بِاُمِّ الْکِتَابِ وَجَمِیْعُ مَا

کامل کے فاتحہ ہے جس کا نام ام الکتاب ہے اور تمام

فِی الْکِتَابِ مُفَصَّلٌ فِیْھَا مُجْمَلٌ وَمَا فِیْھَا

وہ چیز کہ بیچ کتاب کے مفصل ہے بیچ اس کے مجمل ہے اور وہ چیز کہ بیچ اس کے

مُجْمَلٌ فَھُوَ فِی الْکِتَابِ مُفَصَّلٌ وَالْفَاتِحَۃُ

مجمل ہے وہ بیچ کتاب کے مفصل ہے اور فاتحہ

فِی الْبَسْمَلَۃِ وَالْبَسْمَلَۃُ فِی الْبَاءِ وَالْبَاءُ فِی النُّقْطَۃِ

بیچ بسم اللہ کے ہے اور بسم اللہ بائے میں اور با نقطہ میں

مُنْدَرِجَۃٌ[۱]

داخل ہے۔

پس معلوم ہوا کہ قرآن کریم کا خلاصہ سورۂ فاتحہ، اس کا خلاصہ بسم اللہ شریف، اس کا خلاصہ بائے اور اس کا خلاصہ بائے کا نقطہ ہے۔ چنانچہ ینابیع المودت میں حضرت عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے کہ حضرت علیؑ نے دورانِ

---

[۱] مرآت العارفین از تصنیف لطیف سید العارفین سبطِ رسول رب العالمین سید الشہداء مقبولِ خالق کونین حضرت امام حسینؓ ص ۲۶-۲۷

تدریس فرمایا۔ "بسم اللہ کی بائے کا نقطہ جو خلاصۂ قرآن ہے وہ میں ہی ہوں"
بلاشبہ حضرت علی علیہ السلام قرآن ناطق تھے۔ رسولِ مقبول صلعم نے فرمادیا
تھا کہ وہ علم کے شہر ہیں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔
چنانچہ حضرت علی علیہ السلام فرمایا کرتے تھے: "اے لوگو! مجھ سے
اس وقت تک جو چاہو پوچھ لو جب تک کہ میں تم میں موجود ہوں"۔ آپ
ہی کا یہ قول بھی تھا کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ اور ان کی ذات کے درمیان
کے تمام حجابات اٹھا دیے جائیں تب بھی ان کے ایمان میں کوئی اضافہ نہ
ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہیئے کہ وہ حق الیقین کی معراج حاصل کر
چکے تھے۔ اقبال رح نے حضرت علی علیہ السلام کو بائے بسم اللہ بدیں وجہ
بھی کہا ہے کہ آپ بہترین مفسرِ قرآن تھے۔ چنانچہ آپ فرمایا کرتے
"میں قرآنی آیات کے نزول کا محل و مقام خوب جانتا ہوں۔ مجھے بخوبی
علم ہے کہ کونسی آیت کہاں اور کس لیے نازل ہوئی ہے"۔ بلاشبہ آپ
علومِ قرآنی کا دروازہ تھے۔ تصوف کے چار میں سے تین سلسلے آپ
پر منتہی ہوتے ہیں۔ صحابہؓ آپ کو اپنے میں کا بہترین قاضی تسلیم کرتے
تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے لَوْ لَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ۔
یعنی اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا"۔
اقبال فرماتے ہیں کہ اللہ اللہ! حضرت حسینؓ کے والد حضرت علی
علیہ السلام کی ذات کتنی اعلیٰ وارفع تھی کہ علومِ قرآنی کے شہر کا دروازہ
قرار دیے گئے۔ جب باپ اتنی شان والے تھے تو بیٹے حضرت حسینؑ

بھی بڑی ارفع ذات والے ہوتے اور حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی قربانی کا فدیہ ہو کر ذبح عظیم قرار پاتے۔ آپ کے نزدیک مفسرین کا یہ قول کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کا فدیہ جنت سے لایا ہوا وہ مینڈھا تھا جسے اللہ تعالےٰ نے ہابیلؑ کی قربانی کے وقت قبول فرمایا تھا اور وہی ذبح عظیم قرار پایا! یا بعض مفسّرین کا یہ کہنا کہ وہ مینڈھا جبلِ یثرب سے اترتا ہوا آیا تھا اور ذبح ہو کر فدیہ بنا، درست نہیں ہے۔ آپ ایک جلیل القدر پیغمبر کا فدیہ ایک مینڈھے کو، خواہ وہ جنت سے ہی کیوں نہ لایا گیا ہو، قرار نہیں دے سکتے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی قربانی کا "ذبحِ عظیم" فدیہ جو ان کی نسل کے بعد میں آنے والوں کے لیے چھوڑا گیا حضرت حسین علیہ السّلام ہی ہو سکتے ہیں جو پیغمبر آخرالزماں کے فرزندِ دلپذیر تھے۔ حضرت رسول مقبول صلعم حضرت علیؑ سے فرمایا کرتے تھے کہ "اے علی! تم میرے داماد اور میرے بیٹے کے باپ ہو۔" حق بھی یہی ہے کہ آنحضرت صلعم کی نسل حضراتِ حسنینؑ سے ہی اس دنیا میں قائم ہے۔ اللہ تبارک وتعالےٰ نے آیۂ مباہلہ میں بھی حضراتِ حسنینؑ کو آنحضور صلعم کے فرزند ارشاد فرمایا ہے۔ حقیقت تو یہی ہے کہ ارشادِ باری تعالےٰ نے وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۔ یعنی "جب حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو ماتھے کے بل پچھاڑا اور ہم نے

---

۱ ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفا - از شاہ ولی اللہ رح (ترجمہ اردو)

پکارا یوں کہ اے ابراہیم! تو نے سچ کر دکھایا خواب - ہم یوں بدلہ دیتے ہیں نیکی کرنے والوں کو - بیشک یہی ہے صریح جانچنا) اور اس کا بدلہ دیا ہم نے ایک عظیم ذبیحہ اور باقی رکھا اسے پچھلی خلق میں - سلام ہے ابراہیم پر۔

اقبال رح نے حضرت حسین علیہ السلام کی کربلا میں شہادت کو ہی ذبحِ عظیم قرار دیا ہے جس کی مندرجہ ذیل وجوہ ہیں:

۱- حضرت حسین علیہ السلام بنی اسمٰعیل میں سے ہیں -
۲- آپ فرزندِ نبیؐ آخر الزماں ہیں - لہٰذا آپ کا شمار آخرین میں ہے -
۳- آپ کربلا میں شعائر اللہ کی حفاظت کے لیے شہید ہوئے -
۴- آپ کربلا میں قربانی کے لیے مانندِ اسمٰعیلؑ خود اپنی خوشی سے تشریف لے گئے -
۵- آپ نے اپنی قربانی اللہ تعالےٰ کے مطالبہ پر پیش کی جو قبول ہوئی -

ان صریح دلائل کے باوجود اگر ہم حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی قربانی کا فدیہ جنت سے لائے گئے ایک مینڈھے کو یا اپنے ان مینڈھوں، بکروں، گایوں اور اونٹوں کو جنہیں ہم عید الضحیٰ پہ ذبح کرتے ہیں قرار دے دیں تو یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے - بلاشبہ حضرت حسین علیہ السلام ہی "ذبحِ عظیم" تھے جنھوں نے کربلا میں اپنی قربانی پیش کر کے اس شرف کا تاج اپنے سر پہ رکھا -

(۱۷)

بہر آں شہزادۂ خیر الملل ‏ ‏ دوشِ ختم المرسلین نعم الجمل

شمائل ترمذی میں منقول ہے کہ ایک دفعہ امام حسین علیہ السلام دوشِ مبارک پر سوار تھے۔ کسی نے کہا "کیا اچھی سواری ہاتھ آئی ہے؟" آپ نے فرمایا "سوار بھی کیسا ہے"۔ علامہ اقبال نے اس روایت کو شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ امتِ مسلمہ کہ خیر الامم ہے، کے شہزادے حضرت حسین علیہ السلام کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دوشِ مبارک بہترین سواری تھا۔ اس بیان سے ڈاکٹر صاحب کا مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ آنحضرت صلعم حضرت حسینؑ سے والہانہ محبت فرمایا کرتے تھے۔ بلاشبہ یہ ایک حقیقت تھی جس کی تصدیق احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ آنحضور صلعم فرمایا کرتے تھے:

"حسینؑ میرا ہے اور میں حسینؑ کا ہوں۔
خدا اس سے محبت رکھے جو حسین سے محبت رکھتا ہے۔" [۱]

(۱۸)

سُرخ رُو عشقِ غیور از خونِ او
شوخیِ این مصرع از مضمونِ او

غیرت مند عشق حضرت حسین علیہ السلام کے پاک خون سے ہی معزز و موقر ہوا۔ چنانچہ عنوانِ عشقِ غیور کی اہمیت آپ کی کربلا میں شہادت ہی سے قائم ہے۔ اقبالؒ نے بجا فرمایا، حضرت حسین علیہ السلام نے مالکِ حقیقی سے عشق کی غیرت پر حرف نہ آنے دیا اور اثباتِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے

---

[۱] سیرت النبی حصہ دوم ص ۳۰۴

برضا و رغبت اپنا خون پیش کر دیا۔

(۱۹)

درمیانِ اُمّت آں کیواں جناب
ہمچو حرفِ قُل ھُوَ اللہ در کتاب

اقبالؔ حضرت حسین علیہ السّلام کی ذاتِ ستودہ صفات اور اعلیٰ و ارفع شخصیت کو اُمّتِ مسلمہ میں اتنا ہی رفیع و منیع قرار دیتے ہیں جتنا کہ حرفِ "قُل ھُوَ اللہ" قرآن کریم میں ہے۔ یہ سچ ہے آنحضور صلعم کی بعثت اور قرآنِ مجید کا نزول توحیدِ الٰہی کے اثبات کے لیے ہی عمل میں آیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی تمام آیات توحیدِ باری تعالےٰ کی طرف ہی رہنمائی کرتی ہیں۔ جیسے توحیدِ ربّانی قرآنِ کریم کی اصل اصول ہے بالکل اسی طرح حضرت حسین علیہ السّلام بھی اُمّتِ محمد صلعم میں بنیادی اور مرکزی اہمیت کے حامل ہیں۔ درحقیقت قرآنِ کریم کی افادیت توحید سے قائم اور اُمّتِ مسلمہ کی ہدایت سبطِ رسولؐ سے باقی ہے۔

(۲۰)

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؓ و یزید
ایں دو قوت از حیات آمد پدید

اللہ تبارک و تعالےٰ نے جب حضرت آدم علیہ السّلام کو پیدا کر کے اپنا خلیفہ نامزد فرمایا اور جمیعِ ملائکہ کو ان کے سامنے سجدۂ تعظیمی کا حکم دیا، تو سوائے ابلیسِ مردود کے سب نے امرِ الٰہی کی تعمیل کی۔ چنانچہ باری تعالےٰ نے ابلیس کو نافرمانی کے جرم کی پاداش میں راندۂ درگاہ قرار

دے دیا۔ پس ابتدائے آفرینش اور آغازِ حیات سے ہی دو متحارب قوتیں قائم ہو گئیں۔ پہلی طاقت "قوتِ حق" اور دوسری طاقت "قوتِ باطل" قرار پائی۔ حضرت آدم علیہ السلام کا ابلیس سے مسابقہ ہوا، حضرت ہابیلؑ کا قابیل سے، حضرت نوحؑ کا ان کی قوم کے ملحدوں سے، حضرت ابراہیمؑ کا نمرود سے، حضرت موسیٰؑ کا فرعون سے، حضرت عیسیٰؑ کا مشرکینِ یہود سے، حضرت ہاشمؓ کا امیہ سے، حضرت عبدالمطلبؓ کا حرب سے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ابوسفیان، ابوجہل اور ابی لہب سے، حضرت علی علیہ السلام کا معاویہ اور خوارج سے، اور حضرت حسین علیہ السلام کا یزید سے مقابلہ رہا۔ غرضیکہ اہلِ حق اور اہلِ باطل ہمیشہ مصروفِ پیکار رہے ہیں۔ علامہؒ نے ایک اور جگہ فرمایا ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

آپ نے ایک دوسری جگہ اسی مضمون کو یوں پیش کیا ہے ؎

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

المختصر حق و باطل کی آویزش ابتدائے حیات سے شروع ہے اور انتہائے حیات تک جاری رہے گی۔

(۲۱)

زندہ حق از قوتِ شبیری است
باطل آخر داغِ حسرت میری است

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے مضمون زیرِ عنوان "عشرۂ محرم الحرام" میں رقمطراز ہیں: " دنیا میں ہر چیز مرجاتی ہے کہ فانی ہے۔ مگر خونِ شہادت کے ان قطروں کے لیے جو اپنے اندر حیاتِ الٰہیہ کی روح رکھتے ہیں، کبھی بھی فنا نہیں۔ سب سے پہلا نمونہ جو یہ حادثۂ عظیمہ (واقعۂ کربلا) ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ دعوت الی الحق اور حق و حریت کی راہ میں اپنے تئیں قربان کرنا ہے"۔ اقبال رح بھی یہی فرماتے ہیں کہ حق یعنی دینِ اسلام حضرت حسین علیہ السلام کی قربانی سے ہی زندہ ہے۔ اس کے مقابلے میں باطل سبطِ رسول سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ یزید کے مقابلے میں حضرت حسین علیہ السلام حفظِ ناموسِ رسول صلعم اور حمایتِ اصلِ اصولِ دینِ اسلام میں گو وقتی طور پر غالب نہ ہو سکے لیکن آخر الامر فتح آپ ہی کی ہوئی اور حق کا بول بالا ہوا۔ آج تیرہ سو سال گزرنے پر بھی شریعتِ اسلام کے اصول زندہ ہیں جن کے لیے فرزندِ رسولؐ نے اپنی اور اپنے اعزہ کی قربانی دی مگر ان کے مقابلے پر آنے والی باطل قوت پاش پاش ہو چکی ہے۔ حضرت حسین علیہ السلام پر دینِ حق کے زندہ رہنے کے باعث اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت و برکت اور مسلمانوں کی طرف سے درود و سلام کی بارش ہو رہی ہے۔ اور باطل کی پُر حسرت موت کی بنا پر یزید اللہ اور اس کے نیک بندوں کی لعنتوں کا مستحق ٹھہرا ہے۔[1]

---

[1] شہید اعظم از ابوالکلام آزاد صفحہ ۸۳، ۸۴

(۲۲-۲۵)

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت | حریت را زہر اندر کام ریخت
خاست آں سر جلوۂ خیر الامم | چوں سحاب قبلہ باراں در قدم
بر زمینِ کربلا بارید و رفت | لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
تا قیامت قطع استبداد کرد | موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ جب خلافت نے قرآن کریم سے تعلق توڑ لیا یعنی یہ کہ قرآنی اصولوں کو چھوڑ کر ملوکیت میں بدل گئی، اور اس طرح آزادی کے حلق میں زہر ٹپکایا، یعنی یہ کہ عوام کے حقوقِ آزادیٔ رائے کو غصب کر لیا، تو حضرت حسین علیہ السلام سیدِ امتِ مسلمہ مسلمانوں پر اس ظلم کو برداشت نہ کر سکے۔ اور ابرِ رحمت بن کر آگے بڑھے۔ آپ نے کربلا کے ویرانے پر رحمتِ آزادی کی بارش کی اور اسے اپنے پاک خون سے سیراب کر کے وہاں آزادی کے لیے جان قربان کرنے کی سنت قائم کر گئے۔ آپ کے اس عمل نے قیامت تک کے لیے ظلم و ستم کا خاتمہ کر دیا اور اس طرح آپ اپنے خون سے دنیا میں آزادی کی بہار لے آئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد حضرت حسین علیہ السلام کے اس جہادِ فی سبیل اللہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ بنی امیہ کی حکومت ایک غیر شرعی حکومت تھی۔ کوئی حکومت جس کی بنیاد جبر و شخصیت پر ہو کبھی اسلامی حکومت نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے اسلام کی روحِ حریت و جمہوریت کو غارت کیا اور مشورہ و اجتماعِ امت کی جگہ محض غلبۂ جابرانہ اور مکر و خدع پر اپنی شخصی حکومت

کی بنیاد رکھی۔ ان کا نظامِ حکومت شریعتِ الٰہیہ نہ تھی بلکہ بعض اغراضِ نفسانیہ مقاصدِ سیاسیہ پہ مبنی تھا۔ ایسی حالت میں ضرور تھا کہ ظلم و جبر کے مقابلہ کی ایک مثال قائم کی جاتی اور حق و حریت کی راہ میں جہاد کیا جاتا۔ حضرت سیدالشہداء نے اپنی قربانی کی مثال قائم کر کے مظالمِ بنی امیہ کے خلاف جہادِ حق کی بنیاد رکھی اور جس حکومت کی بنیاد ظلم و جبر پہ تھی اس کی اطاعت و وفاداری سے انکار کر دیا۔ پس یہ نمونہ تعلیم کرتا ہے کہ ہر ظالمانہ و جابرانہ حکومت کا اعلانیہ مقابلہ کرو اور کسی ایسی حکومت سے اطاعت و وفاداری کی بیعت نہ کرو جو خدا کی بخشی ہوئی انسانی حریت و حقوق کی غارت گر ہو اور جس کے احکام مستبدہ و جابرہ کی بنیاد صداقت و عدالت کی جگہ جبر و ظلم پہ ہو۔ مقابلے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ تمہارے پاس قوت و شوکتِ مادی کا وہ تمام ساز و سامان بھی موجود ہو جو ظالموں کے پاس ہے۔ کیونکہ حسینؑ ابن علیؑ کے ساتھ چند ضعفاء و مساکین کی جمعیتِ قلیلہ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ حق و صداقت کی راہ نتائج کے فکر سے بے پروا ہے۔ نتائج کا مرتب کرنا تمہارا کام نہیں۔ یہ اسی قوتِ قاہرہ عادلۂ الٰہیہ کا کام ہے جو حق کو باوجود ضعف و فقدانِ انصار کے کامیاب و فتح مند کرتی اور ظلم کو باوجود جمعیت و عظمتِ دنیوی کے نامراد و نگوں سار کرتی ہے[1]

علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد نے خوب فرمایا ہے کہ خلفائے راشدین

---

[1] شہیدِ اعظم صفحہ ۸۴-۸۵

کے بعد خلافت کا تعلق قرآن کریم سے عملی طور پر ٹوٹ چکا تھا۔ خلافت ملوکیت میں بدل چکی تھی۔ بیت المال کو سربراہ حکومت نے اپنی ذاتی ملکیت قرار دے دیا تھا۔ ذاتی اغراض کے حصول کے لیے داد و دہش بیت المال سے ہی ہونے لگی تھی۔ امیر معاویہ نے یزید کو ولی عہد نامزد کر کے قیصر و کسریٰ کی سنت اختیار کر لی تھی۔ یزید کی بیعت کے لیے ترغیب و ترہیب کے تمام جائز و ناجائز وسائل اور ذرائع استعمال کیے گئے۔ اکثر عمال بنو امیہ سے مقرر کیے گئے جنھوں نے عوام کے شہری حقوق کو غصب کیا۔ حضرت علیؑ جیسے برگزیدہ صحابی پر مساجد میں برسرِ منبر سب و شتم جاری کیا گیا۔ تمام مملکت میں ظلم و استبداد کا دَور دورہ تھا۔ معاویہ کے بعد یزید سریر آرائے سلطنت ہوا، جس نے حضرت حسین علیہ السلام سے اپنے والی کے ذریعہ بیعت طلب کی۔ آپ نے فاسق و فاجر کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ حرمین شریفین کے احترام کے پیشِ نظر انھیں چھوڑا اور اثبات حق کے لیے کربلا میں تین دن تک بھوکے پیاسے رہ کر اپنی، اپنے اقربا اور انصار کی قربانی پیش کر دی۔ گو بظاہر آپ کو شکست ہوئی لیکن تاریخ اسلام شاہد ہے کہ آپ نے جو اسلامی اصولوں کی حفاظت کے لیے قربانی کی وہ رائگاں نہ گئی اور جہاں ظلم و جور کی حکومت تباہ ہوئی وہاں مسلمانوں کے لیے آزادی اور شریعت اسلامیہ کی حفاظت میں جان تک کی قربانی دینے کی سنت باقی رہ گئی۔ آپ کی قربانی نے حق کو روشن کر دیا اور اس طرح باطل کے مکر و خدع کی ظاہری دلکشی خاک میں مل گئی۔ المختصر آپ نے یزید کی بیعت نہ کر کے قیامت تک کے لیے ظلم و ستم کو متروک قرار دے دیا اور

دنیا میں اسلامی اصولوں کی بقا سے بہار آگئی۔

(۲۶)

بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است

پس بنائے لا الہ گردیدہ است

علامہ فرماتے ہیں کہ حضرت حسین علیہ السلام اثباتِ حق کے لیے ہی خاک و خون میں لوٹے اور یہی وجہ ہے کہ انھیں توحید کے قیام و استحکام کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ اسی مضمون کو حضرت معین الدین چشتی سنجریؒ نے ایک رباعی میں خوب ادا کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

شاہ ہست حسینؑ بادشاہ ہست حسینؑ

دیں ہست حسینؑ دین پناہ ہست حسینؑ

سر داد نداد دست در دستِ یزید

حقا کہ بنائے لا الہ ہست حسینؑ

دوسرے اہلِ دل فرماتے ہیں:

رہا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ایک اور حق پرست نے کیا خوب فرمایا ہے: ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را

ہر زماں از غیب جانے دیگر است

نظیری نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

گریزد از صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست

بلاشبہ حضرت حسین علیہ السلام نے دینِ اسلام کی حفاظت میں جان دی ہے۔ ان ہی کی قربانی نے توحید کا اثبات کیا۔ آپ نے یزید کی بیعت نہ کر کے یہ عملی اعلان کیا کہ فرمانبرداری صرف اللہ تعالےٰ کی ہی کرنی چاہیئے اور اس کے حکم کے مقابلے میں ہر ماسوائی قوت کے جبر کی ہرگز پروا نہ کرنی چاہیئے۔

(۲۷)

مدعایش سلطنت بودے اگر
خود نکردے با چنیں ساماں سفر

حضرت حسین علیہ السلام کا یزید کی بیعت نہ کرنے کا واحد سبب دینِ اسلام کے اصولوں کی حفاظت ہی تھا۔ اگر ان کا مقصد حصولِ سلطنت ہوتا تو وہ مکے سے اس بے سر و سامانی کی حالت میں ہرگز نہ نکلتے۔ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ آپ کے ساتھ مکے سے آپ کے خاندان کے چھوٹے بڑے اور چالیس کے قریب احباب ایک قافلے کی صورت میں روانہ ہوئے تھے۔ اقبالؒ کے نزدیک حکومت کے حصول کے لیے ایسی بے سر و سامانی میں اس طرح مخدراتِ عصمت کے ساتھ نہیں جایا جاتا۔ اس قسم کی مہمات کے لیے لشکر اکٹھا کر کے بڑے ساز و سامان کے ساتھ روانہ ہوا جاتا ہے۔ جب مکے سے روانگی کے بعد راستے میں آپ کو حضرت مسلمؓ کی شہادت کی خبر ملی تو آپ نے جمعیت کو بڑھانے کی بجائے چراغ تک گُل کر کے لوگوں کو ان کی

جانِ عزیز لے بھاگنے کی اجازت دے دی۔ اس موقع پہ وہی لوگ علیحدہ ہو کر منتشر ہوئے جو ذاتی اغراض لے کر راستے میں ساتھ ہو لیے تھے بلکہ کرد سے آپ کے ہمراہ روانہ ہونے والوں نے کسی صورت میں بھی آپ کی نصرت سے منہ نہ موڑا یہاں تک کہ میدانِ کربلا میں آپ کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔

(۲۸)

دشمناں چوں ریگِ صحرا لاتعد
دوستانِ او بہ یزداں ہم عدد

حضرت حسین علیہ السلام کے دشمن ریگستان کے ذروں کی طرح لاتعداد تھے جب کہ ان کے مقابلے میں اہلِ حق یعنی آپ کے مددگار صرف بہتر تن تھے۔ یہی وہ سعید تھے جن کی شہادت کے بعد ان کے سر نیزوں پہ کربلا سے کوفہ و دمشق لے جائے گئے۔

(۲۹)

رِستر ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ بود
یعنی آں اجمال را تفصیل بود

علامہ اقبال کے اسی شعر کے مطالب کو مولانا ابوالکلام آزاد کے مضمون "شہادتِ حسینؓ اور اسلام" میں مطالعہ کیجیے۔ آپ فرماتے ہیں:

اسلام کے ظہور تک خدا کی راہ میں جو قربانیاں ہوئی تھیں وہ محض شخصی حیثیت رکھتی تھیں یعنی انبیاء نے شخصی طور پہ اپنی اولاد کو یا اپنے

آپ کو قربان کر دیا تھا۔ جہاد کی یہ ابتدا تھی۔ مگر اس کی تکمیل شریعتِ اسلام پر موقوف تھی۔ چنانچہ اسلام نے جس طرح عقائد و عبادات اور معاش و معاد میں تمام قدیم مذاہب کی تکمیل کی، اسی طرح جہاد کی حقیقت کو بھی مکمل اور واضح کر دیا۔

اب تک کسی پیغمبر کے خاندان نے جہاد میں کوئی حصّہ نہیں لیا تھا۔ شخصی طور پر جو قربانیاں کی گئیں وہ راہ ہی میں روک لی گئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اپنے لختِ جگر کو خدا کی نذر کرنا چاہا، لیکن اس کا موقع ہی نہ آیا۔ حضرت عیسٰی علیہ السّلام سولی کی طرف بڑھے، لیکن بچا لیے گئے۔ آج تک تمام خاندانِ نبوّت نے متّفقہ طور پر اس میں شرکت نہیں کی تھی، اور اس کی کوئی نظیر تمام سلسلۂ انبیاء میں نظر نہ آئی تھی کہ صرف بھائی، صرف بیٹا، صرف بیوی ہی نے مقصدِ نبوّت میں ساتھ نہ دیا ہو، بلکہ بلا تمیز خاندانِ نبوّت کے اکثر اعضاء و ارکان راہِ حق میں قربان ہوئے ہوں۔

یزید کی شخصی خلافت کی بیعت کے لیے جو ہاتھ بڑھے تھے وہ اسلام کی جمہوریت کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے۔ مذہب کی قربانیاں صرف امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہی کے لیے ہوا کرتی ہیں۔ اس لیے جب اسوۂ ابراہیمی کے زندہ کرنے کا ٹھیک وقت آ گیا تو خاندانِ نبوّت کے زن و مرد، بال بچّے، غرض ہر فرد نے اس میں حصّہ لیا، اور جن قربانیوں کے پاک خون سے زمین کی آغوش اب تک خالی تھی ان سے کربلا کا میدان رنگ گیا۔

پس حضرت حسین علیہ السّلام کا واقعہ کوئی شخصی واقعہ نہیں ہے۔ اس کا تعلق صرف اسلام کی تاریخ ہی سے نہیں بلکہ اسلام کی اصل حقیقت سے ہے۔ یعنی وہ حقیقت جس کا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ذات سے ظہور ہوا تھا۔ وہ بتدریج ترقی کرتی ہوئی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی ذات تک پہنچ کر گم ہو گئی تھی۔ اس کو حضرت حسین علیہ السّلام نے اپنی سر فروشی سے مکمل کر دیا۔

خاندانِ نبوّت دنیا کے آباد کرنے کے لیے ہمیشہ اجڑتا رہا۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے ہجرت کی، حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے گھر بار چھوڑا، حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے آوارہ گردی کی اور نبوتِ محمدی کے متبعین میں سے حضرت حسین علیہ السّلام نے میدانِ کربلا کے اندر اس خانہ ویرانی کو مکمل کر دیا۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام سے خاندانِ نبوّت کا سلسلہ ملا ہوا ہے۔ انھوں نے ایک وادیٔ غیر ذی ذرع میں شدتِ تشنگی سے ایڑیاں رگڑ دی تھیں۔ حضرت حسین علیہ السّلام نے بھی میدانِ کربلا میں اس خاندانی روش کو زندہ کیا۔"[1]

ڈاکٹر صاحب نے قرآن کریم، کتب احادیث اور تواریخِ اسلام کا بنظرِ تحقیق مطالعہ کیا تھا۔ آپ جانتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے بت شکنی کی، نمرود سے دو بدو ہوئے، آگ میں ڈالے گئے، ہجرت کی، اپنے فرزندِ ارجمند

---

[1] شہیدِ اعظم صفحہ ۱۱۱ تا ۱۱۳

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بحکم خدا مکّے کے غیر آباد علاقے میں چھوڑا اور اللہ تعالےٰ کا ایما پاکر اس کی خوشنودی کے لیے ان کو اپنی طرف سے تو ذبح کر ہی ڈالا۔ اور اسی طرح سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اپنے آپ کو خوشی سے راہِ خدا میں ذبح کیے جانے کے لیے پیش کیا۔ یہ دوسری بات تھی کہ وہ ذبیح نہ ہو سکے اور ان کا فدیہ ان کی آنے والی نسل میں سے خاتم النّبیین اور ختم المرسلین کے فرزند عزیز کی راہِ حق میں قربانی کو "ذبح عظیم" قرار دے کر کیا گیا۔ حضرت حسین علیہ السلام دینِ حق کی حفاظت کے لیے ان تمام مراحل سے گزرے جن سے آپ کے اجداد حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام گزر چکے تھے۔ آپ نے اپنے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح نمرودِ وقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے سے انکار کیا، ملوکیت کے بتوں کو توڑا، مدینے سے مکّے اور وہاں سے کربلا کی طرف ہجرت کی، کربلا کے غیر آباد علاقے میں اپنے خاندان کو لے گئے اور اللہ تعالےٰ کا ایما پاکر اس کی خوشنودی کے لیے اپنی اولاد، اپنے اعزہ و اقربا اور اصحاب کو راہِ حق میں قربان کر ڈالا۔ اپنے جدّ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی طرح اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کیا اور میدانِ کربلا میں شہید ہو کر شرفِ "ذبحِ عظیم" کا تاج سر پہ رکھا اور فائز المرام ہوئے۔ غرضیکہ آپ نے اپنی قربانی پیش کر کے حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہم السلام کی راہِ خدا میں جدوجہد کی تشریح، توضیح اور تفسیر پیش کی۔

(۳۰ - ۳۱)

عزمِ او چوں کوہساراں استوار   پائدار و تند سیر و کامگار
تیغ بہرِ عزتِ دین است و بس   مقصدِ او حفظِ آئین است و بس

حضرت حسین علیہ السلام کا عزم پہاڑوں کی مانند صمیم و محکم تھا۔ آپ نے راہِ حق میں جان قربان کرنے کا جو ارادہ کیا اس پہ قائم رہے اور تیزی سے اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا کر فائز المرام ہوئے۔ آپ کی تلوار ناموسِ دین کے لیے ہی میان سے نکلی تھی جس سے آپ کا مقصد دینِ اسلام کے محکم اصول کا تحفظ تھا۔

تاریخ کے مطالعہ کے لیے درایتِ سلیم کی اشد ضرورت ہے۔ مورخین یہاں تک کہ عمر ابو النصر اور ابو الکلام آزاد جیسے دراک بھی روایاتِ ضعیفہ کی رو میں بہ گئے ہیں اور رقمطراز ہیں کہ حضرت حسین علیہ السلام نے عمر بن سعد کے سامنے تین شرطیں پیش کیں:

۱۔ مجھے وہیں لوٹ جانے دو جہاں سے آیا ہوں۔
۲۔ مجھے خود یزید سے اپنا معاملہ طے کر لینے دو۔
۳۔ مجھے مسلمانوں کی کسی سرحد پہ بھیج دو۔ وہاں کے لوگوں پہ جو گزرتی ہے وہی مجھ پہ گزرے گی۔ [1]

ان شرائط سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسین علیہ السلام نے حصولِ خلافت

---

[1] شہیدِ اعظم ص۲۸ و الحسین (ترجمہ اردو) ص۱۱۱

کے لیے خروج کیا تھا۔ چنانچہ جب اپنا مقصد پورا ہوتے نہ دیکھا تو اپنی سلامتی کے لیے درخواست کی۔ حالانکہ اہلِ بصیرت جانتے ہیں کہ نبیؐ، علیؑ اور فاطمہؑ کا یہ پروردہ خوب سوچ سمجھ کر مدینے سے روانہ ہو کر مکے پہنچا تھا۔ مدینے سے حج کے لیے پچیس بار پاپیادہ آنے والا مکے سے یوم حج سے صرف دو روز پہلے دوستوں کے مشورے کے خلاف کوفہ کو روانہ ہوا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مدینے اور مکے میں اس کی نصرت کے لیے لوگ تیار نہ تھے۔ وہاں قریش کی آبادی زیادہ تھی جو بیچ در بیچ وجوہ کی بنا پر حضرت علی علیہ السلام کا بھی ساتھ دینے پہ تیار نہ ہوئے تھے جس کے باعث وہ مدینے سے کوفے منتقل ہونے پر مجبور ہوئے۔ حضرت حسینؑ کے پیشِ نظر حرمین شریفین کا احترام بھی تھا اور آپ وہ میدان نہ بننا چاہتے تھے جس سے حرم محترم کی حرمت زائل ہو۔ ان حقائق کے اظہر من الشمس ہونے کے بعد یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے ان ہی مقامات کی طرف واپسی کی درخواست کی جہاں سے وہ خوب سوچ سمجھ کر روانہ ہوئے تھے۔ پہلی کی طرح دوسری شرط بھی پکار پکار کے خود کو وضعی کہہ رہی ہے۔ حضرت حسین علیہ السلام یزید کو خوب جانتے تھے کہ وہ معاویہ کا بیٹا اور فاسق و فاجر ہے۔ اس سے کسی اچھے سلوک کی امید ایک معمولی سمجھ کا انسان بھی نہ کر سکتا تھا، چہ جائیکہ بابِ مدینۂ علم کا فرزندِ ارجمند ایسے شخص سے اصلاح و بہتری کا خواہاں ہوتا۔ تیسری شرط بھی دراتنا ضعیف ہے اور وہ اس لیے کہ مسلمانوں اور دینِ اسلام سے لاتعلقی کا گمان ابنِ رسول اللہ صلعم پہ کسی طرح

نہیں کیا جا سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ نے اسلامی اصولوں کی حفاظت کے لیے دشتِ کربلا میں اپنی، اپنے اعزہ و اقربا اور احباب کی قربانی پیش کی ہے۔ آپ نے یزید کی بیعت نہ کر کے مسلمانوں کے لیے ایک محکم سنت چھوڑی ہے کہ فاسق و فاجر کی اطاعت ہرگز نہ کرنی چاہیے خواہ جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔

(۳۳-۳۲)

ماسوا اللہ را مسلمان بندہ نیست
پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست

خونِ او تفسیرِ ایں اسرار کرد
ملتِ خوابیدہ را بیدار کرد

مسلمان سوائے اللہ پاک کے کسی کا بندہ نہیں ہو سکتا اور اس کا سر کسی بھی طاغوتی طاقت کے سامنے نہیں جھک سکتا۔ حضرت حسین علیہ السّلام کی قربانی نے اس راز کی تفسیر پیش کی اور اس طرح سوئی ہوئی اُمتِ مسلمہ کو بیدار کر دیا۔ اقبالؒ نے درست فرمایا ہے۔ مسلمان سوائے اللہ تعالیٰ کے تمام طاقتوں سے رشتہ توڑ چکتا ہے۔ اس کی تمام کوششیں باری تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کے لیے ہوتی ہیں۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا اور بات چیت سب اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے پابند ہوتے ہیں۔ وہ دنیا کی کسی خارجی قوت سے خوف نہیں کھاتا اور نہ ہی نفسِ امارہ سے مغلوب ہوتا ہے۔ اسے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مطلوب ہوتی ہے، جس کے حصول کے لیے وہ اپنی جان کی قربانی پیش کرنے میں بھی پس و پیش نہیں کرتا۔ حضرت حسین علیہ السلام عاشقِ مالکِ حقیقی تھے۔ چنانچہ انھوں نے فرعونِ وقت یعنی یزید کی طاغوتی قوت

کی ذرہ برابر بھی پروانہ کی اور دینِ اسلام کے زرّیں اصولوں کی حفاظت میں اپنی جان تک قربان کردی۔ آپ نے سب مصائب اس لیے برداشت کیے کہ مسلمانوں کے لیے ایک زندہ سنّت چھوڑ جائیں تاکہ وہ اس پر عمل پیرا ہوکر اللہ تعالےٰ کی رضا حاصل کریں جو انسانی زندگی کا منتہائے مقصود ہے۔

(۳۶-۳۴)

تیغ کا چوں از میاں بیروں کشید — از رگِ ارباب باطل خوں کشید
نقشِ الا اللہ بر صحرا نوشت — سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت
رمزِ قرآں از حسینؓ آموختیم — ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم

حضرت حسین علیہ السلام نے نفیٔ ماسوا کی تلوار کو بے نیام کیا اور اس کی یورشِ بے پناہ سے اہلِ باطل کی شہ رگ کو کاٹ ڈالا۔ اس ابطالِ باطل کے بعد آپ نے دشتِ کربلا کے صفحے پر نقشِ توحید تحریر فرمایا اور اس طرح سنّتِ حقا کو قائم کرکے ہمارے لیے نجات کا راستہ بنایا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم نے رمزِ قرآن یعنی توحید کا سبق حضرت حسینؓ سے ہی حاصل کیا ہے اور مالکِ حقیقی کے عشق کی اس شدید حدّت اور جلن سے جو آپ حاصل کر چکے تھے حقیقی عشق کا سوز و گداز کسب کیا ہے۔

اقبال جہاں اہلِ علم تھے وہاں اہلِ دل بھی تھے۔ انھیں حضرت حسین علیہ السلام سے آپ کی راہِ حق میں قربانی کی بنا پر والہانہ عشق تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ آنحضور صلعم اور حضرتِ علیؓ کے بعد آپ ہی ان کے محبوب تھے۔ وہ مسلمانوں کے لیے آپ کی سنّت پر عمل لازم قرار دیتے ہیں۔ درحقیقت آپ نے ہی

اپنا سب کچھ قربان کر کے اثباتِ حق کیا جو ہم سب کے لیے مشعلِ راہ ہدایت ہے۔

(۳۷-۳۸)

شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت　　سطوتِ غرناطہ ہم از یاد رفت

تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز　　تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز

بنی امیہ نے شام میں بڑی شان و شوکت سے حکومت کی' بنو عباس نے بغداد کو مستقر بنا کر اپنا رعب و دبدبہ دنیا والوں پر بٹھایا اور سلاطین ہسپانیہ نے غرناطہ میں اپنا جاہ و جلال دکھایا۔ خدا شاہد ہے کہ وہ سب مٹ گئے اور ملت نے انھیں یکسر بھلا دیا۔ لیکن حضرت حسین علیہ السّلام نے دشتِ کربلا میں اعلائے کلمۃ الحق کی جو تکبیریں آج سے تیرہ سو سال پیشتر بلند کی تھیں' ان کے تذکرے سے اب بھی ہمارے دل پر چوٹ پڑتی ہے اور ہمارا ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ سچ ہے آخری فتح حق کو ہی نصیب ہوتی ہے اور دوامی قیام اسے ہی حاصل ہے۔ حافظ علیہ الرحمۃ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

بلا شبہ جو لوگ اللہ تعالےٰ کی محبت میں اس کی خوشنودی کے لیے جان کی قربانی دیتے ہیں وہی بقائے دوام حاصل کرتے ہیں حضرتِ حسین علیہ السّلام نے بھی اپنی جان راہِ حق میں دے کر دوامی بقا حاصل کی۔ آپ کی سنت

اب بھی زندہ ہے اور طالبانِ حق کی راہِ ہدایت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

(۳۹)

اے صبا اے پیکِ دُور افتادگاں
اشکِ ما بر خاکِ پاکِ او رساں ¹

علامہ اقبالؒ کا حضرت حسین علیہ السّلام سے والہانہ عشق اور بے پناہ عقیدت اس شعر سے خوب عیاں ہے۔ یہاں آپ نے شعر کی صورت میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ آپ نے قصیدے کا اختتام اس خواہش و استدعا پر کیا ہے کہ صبا جو معشوق سے بچھڑے ہوئے دُور افتادہ عاشق کی پیغامبر ہے ان کے آنسوؤں کو جو حضرت حسینؑ سے دُوری کے باعث آنکھوں سے رواں رہتے ہیں، مزارِ مبارک پر پہنچا دے۔

ڈاکٹر صاحب نے جس انتہائی عقیدت کا اظہار حضرت حسین علیہ السّلام سے کیا ہے بجز دیگر افرادِ اہلبیتِ اطہارؑ کے کسی دوسرے سے نہیں کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کی بے حد عقیدت کی بنیاد سبطِ رسول صلعم کا وہ اسوۂ حسنہ ہے جو آپ نے اثباتِ حق کے لیے دشتِ کربلا میں اپنی جان قربان کر کے پیش کیا ہے۔ یہ سنّت جو آپ نے چھوڑی ہے تمام

---

¹ اسرار و رموز (رموزِ بے خودی) از اقبال ص ۱۲۸

مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہِ ہدایت ہے اور ان کی دنیاوی اور اُخروی فلاح و بہبود کی ضامن ہے۔

تیر و سناں و خنجر و شمشیرم آرزوست
با من میا کہ مسلکِ شبیرؔم آرزوست [1]

اقبالؒ عاشقِ صادق ہیں۔ عشقِ مالکِ حقیقی نے ان کے دل میں سوز و گداز پیدا کر دیا ہے۔ وہ راہِ عشق میں راحت کے خواہاں نہیں بلکہ مصائب برداشت کرنے اور قربانی دینے کے آرزو مند ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نام نہاد عاشق کو خبردار کرتے ہیں کہ وہ عشق کے راستے پر ان کے ہمرکاب نہ ہو۔ بدیں وجہ کہ انھوں نے تو حضرت حسین علیہ السلام کے نقشِ قدم پر چلنے کی خواہش کے تحت عشقِ حقیقی اختیار کیا ہے، جس میں اپنی جان تک کی قربانی دینی پڑتی ہے جو ہر کہ و مہ کے بس کی بات نہیں۔

علامہ نے بجا فرمایا ہے۔ حضرت حسینؑ نے ماسوا سے قطعی طور پر رشتہ ناطہ توڑ لیا تھا۔ وہ اللہ تعالےٰ کے سچے عاشق تھے۔ راہِ عشقِ حقیقی میں آپ کی قربانی بے مثال ہے۔ آپ نے اللہ تعالےٰ کے پسندیدہ دین کے زریں اصولوں کی حفاظت کے لیے مال و دولت، احباب، اعزہ و اقربا اور اولاد، یہاں تک کہ اپنی جان تک کو قربان کر دیا۔ راہِ حق میں ایسی قربانی کوئی عام شخص نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت

---

[1] پیامِ مشرق ۔۔۔ ۔۔تال ص ۱۸۵

ہے۔ آپ کے نزدیک مسلکِ حسینؑ پر چلنے کی خواہش سرخ و سیاہ آندھیوں کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ سچ ہے راہِ حق میں حضرت حسینؑ جیسی قربانی تا قیامت نہ دی جا سکے گی۔

ریگِ عراق منتظر کشتِ حجاز تشنہ کام
خونِ حسینؓ باز دہ کوفہ و شام خویش را[1]

اقبالؒ کے نزدیک حضرت حسین علیہ السلام کی قربانی نے اثباتِ حق اور ابطالِ باطل کیا۔ واقعہ کربلا کے بعد عراقیوں کو احساس ہوا کہ انھوں نے نصرتِ حسینؑ نہ کر کے حق کی مخالفت اور باطل کی امداد کی ہے۔ چنانچہ تلافیٔ مافات کے لیے عبیداللہ بن زیاد کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور باطل کے مٹانے کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ تاریخِ اسلام میں یہ جہاد "توابین کی جنگ" کے نام سے مشہور ہے۔ ان لوگوں کی جدوجہد کامیاب ہوئی اور آخرالامر مختار ثقفی نے سرگروہِ باطل عبیداللہ ابن زیاد کو شکست فاش دی اور اسے دوسرے تمام قاتلانِ حسینؑ کے ساتھ عبرتناک طریقے پر موت سے ہمکنار کیا۔ ادھر حجاز والوں نے اہلِ باطل کے خلاف عَلَم بلند کیا اور اثباتِ حق کے لیے اپنی جانیں قربان کیں۔ یہی وہ سانحہ تھا جس نے مردانِ حُر کے دلوں کو زندہ رکھا اور بنو امیہ کے استبداد کا خاتمہ کر دیا۔ علامہ خوب جانتے ہیں کہ ہر انسان کے ساتھ نفسِ امارہ لگا ہوا

---

[1] زبورِ عجم از اقبال ص۱۴

ہے جو اس کے دل و دماغ کو سفلی خواہشات سے ملوث کر کے اسے تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس شعر میں آپ ہر مسلمان کو مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ حضرت حسین علیہ السلام کے نقشِ قدم پہ چلے اور نفسِ امارہ کو زیر کر کے اپنے کوفہ و شام کو راہِ راست پر لے آئے، یعنی یہ کہ اپنے دل و دماغ سے خواہشاتِ نفسانی کو نکال باہر کرے، تاکہ دونوں سکون حاصل کر سکیں، جو اس کی دنیاوی فلاح اور اُخروی بہبود کا سبب بنے۔

---

(۱)

از نگاہِ خواجۂ بدر و حنین
فقرِ سلطاں وارثِ جذبِ حسینؑ ؎

اقبالؒ ٹیپو سلطان کے فقر کے معترف ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ سلطانِ شہید سادہ زندگی بسر کرنے والا اور راہِ حق میں مر مٹنے والا تھا۔ بلاشبہ وہ حضرت حسینؑ کے نقشِ قدم پر چلا ہے اور اثباتِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے اپنی جان کی قربانی دے کر زندۂ جاوید ہو گیا ہے۔ وہ حضرت شبیرؑ کے مسلک پہ صرف اس وجہ سے چل سکا کہ اس نے سید البشر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کسبِ فیض کیا تھا۔ آنحضرتؐ کے وسیلے اور توسط سے ہی اس میں یہ سکت پیدا ہوئی کہ وہ حضرت حسینؑ

؎ جاوید نامہ از اقبال ص ۲۰۱

کی سنّت پر عامل ہو کر راہِ حق میں قربانی پیش کرنے کے قابل ہوا۔ دوسرے لفظوں میں عشقِ رسولؐ نے ہی ٹیپو سلطان کی رہنمائی عشقِ خدا کی طرف کی، جس سے سرمایہ دار ہو کر وہ حضرت حسینؑ کے جذبۂ قربانی کا وارث قرار پایا۔ علامہ کا خیال ہے کہ اگر مسلمان سنّتِ رسول پہ گامزن ہوں تو ان میں بھی وہ طاقت آجائے جو انہیں سبطِ رسولؐ کے مسلک پہ چلنے کے قابل بنا دے اور وہ بھی راہِ حق میں اپنی جان تک کی قربانی دینے سے دریغ نہ کریں اور اس طرح فائز المرام ہوں۔

(۲)

گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر
مرگِ پورِ مرتضیٰؓ چیزے دگر [1]

مومن عاشقِ خدا و رسول ہوتا ہے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، مرنا جینا سب رسول اللہؐ کی سنّت کے مطابق اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے تحت ہوتا ہے۔ مومن موت سے نہیں ڈرتا بلکہ وہ مالکِ حقیقی سے وصال کا خواہاں ہونے کی بنا پہ اس کو پسند کرتا ہے۔ موت مومن کے لیے رحمت کا سبب بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے لیے شیریں اور پسندیدہ ہے۔ حضرت حسین علیہ السلام نے اثباتِ حق کے لیے اربابِ باطل سے جنگ کی اور راہِ حق میں اپنی جان قربان کر دی۔ آپ کی شہادت آپ

---

[1] جاوید نامہ ص ۲۱۸

کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت تھی۔ آپ سبطِ رسول تھے۔ آپ کا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان دینا عام مومنین کی موت سے بلاشبہ اعلیٰ و ارفع ہے۔ عام مومن موت میں وہ لطف نہیں پاتے جو حضرت حسین علیہ السلام نے دشتِ کربلا میں جان دے کر اٹھایا۔ بات دراصل یہ ہے کہ علامہ اقبال کے نزدیک ابنِ رسولؐ کی قربانی بے مثال ہے۔

---

(۱)

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ [1]

علامہ اقبالؒ کا خیال بالکل درست ہے۔ بلاشبہ بیت اللہ شریف کی داستان عجیب، سادہ اور دلچسپ ہے۔ اس افسانے کے عجیب و غریب، سادہ و سلیس اور دلفریب و دلچسپ ہونے کا واحد سبب یہ ہے کہ اس حرم محترم کے قیام کے لیے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے وادیٔ غیر ذی ذرع میں شدتِ تشنگی سے ایڑیاں رگڑی تھیں، آنحضرت صلعم نے اسے بتوں سے پاک کر کے اس کی حرمت کو بامِ عروج پہ پہنچایا اور حضرت حسین علیہ السلام نے اپنی جان کی قربانی دے کر اس حرمت کو قیامت تک کے لیے محکم بنا دیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ بیت اللہ

---

[1] بالِ جبریل از اقبال ص۹۳

کے حق حرمت کی ادائیگی کا آغاز حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اپنی جان راہِ خدا میں پیش کر کے کیا اور حضرت حسینؑ نے اس قربانی کا فدیہ اپنی جان قربان کر کے ذبحِ عظیم کی صورت میں دے کر اسے انتہائے کمال تک پہنچایا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے:

"وہ حقیقت جس کا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ذات سے ظہور ہوا تھا اور وہ بتدریج ترقی کرتی ہوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات تک پہنچ کر گم ہو گئی تھی، اس کو حضرت حسین علیہ السلام نے اپنی سر فروشی سے مکمل کر دیا۔" [1]

بلاشک و شبہ حضرت حسین علیہ السلام کی قربانی عشقِ حقیقی کی نوازشات کا منتہا تھی۔

(۲)

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیریؑ
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی [2]

حضرت حسین علیہ السلام عاشقِ مالکِ حقیقی تھے۔ راہ حق میں قربانی سے آپ کو وہ اعلیٰ و ارفع مقام حاصل ہوا ہے جو کسی کو نصیب نہ

---

[1] شہادتِ حسین اور اسلام (شہیدِ اعظم) از ابوالکلام ص ۱۱۲

[2] بالِ جبریل ص ۱۰۵

ہو سکا اور نہ ہی تا قیامت ہو سکے گا۔ سبطِ رسولؐ کی قربانی لازوال حقیقت قرار دے دی گئی ہے، جو مردانِ حُر کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اربابِ باطل کا مکر و زور، فریب و دغل اور کذب و دجل نت نئی صورتیں اور راستے اختیار کرتے رہتے ہیں۔ علامہ کے نزدیک حضرت حسین علیہ السلام کی سنت اب تک قائم، اٹل اور محکم ہے۔ بخلاف اس کے ظالموں اور اہلِ باطل کے ہتھکنڈے زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ حق آزاد اور زمانے کے تقاضوں سے بے نیاز ہے جب کہ باطل زمانے کا پابند اور وقت کا غلام ہے۔

(۲۳)

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات[1]

اقبال کا خیال ہے کہ امتِ مسلمہ تمام اسلامی اقدار کھو چکی ہے۔ اس میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو حضرت حسین علیہ السلام کی سنّت پر گامزن ہو کر اثباتِ حق کے لیے باطل سے معرکہ آرا ہو۔ حالانکہ دجلہ و فرات کی سرزمین اب تک ایسے سرفروش شہید کو دعوتِ حق طلبی دے رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ عراق عرب کی سرزمین اب تک باطل کے شکنجے میں ہونے کی وجہ سے مسلمانوں میں کے ہر ایسے

---

[1] بالِ جبریل صـ ۱۵۲

فرد کے لیے پُرکشش ہو گئی ہے جو حضرت حسین علیہ السلام کے نقشِ قدم پر چل کر انھیں استبداد کے چنگل سے نجات دلائے۔ لیکن یہ امر باعثِ مایوسی ہے کہ اس اُمّت میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں ہے جو اسے آزادی دلائے۔ علامہ کی نظروں میں عراقِ عرب پر انگریزوں کا تسلّط بڑی بُری طرح کھٹکتا تھا اور وہ اس کی آزادی کے خواہاں تھے یا امّتِ مسلمہ کی عام غلامی نے انھیں مایوس کر دیا تھا اور انھیں امید نہ تھی کہ اس کا کوئی فرد اسے آزادی سے ہمکنار کرا سکے گا۔

(۴)

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق[۱]

اقبالؒ کے نزدیک عشقِ مالکِ حقیقی ہی قربانی پیش کرنے کی جرأت پیدا کرتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے راہِ صدق اختیار کی اور عشقِ الٰہی سے سرمایہ دار ہو کر بے خطر اثباتِ حق کے لیے جلتی آگ میں کود پڑے۔ آنحضور صلعم نے غزواتِ بدر و حنین میں اسی عشق کی بدولت فتح پائی۔ آپ ہی کی سنّت پر حضرت حسین علیہ السلام نے عمل کیا اور راہِ حق پر گامزن رہ کر تمام مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ انسان کو نفسِ مطمئنہ اور نفسِ امّارہ ہر دو عطا کیے گئے ہیں۔ مالکِ حقیقی کا عشق نفسِ مطمئنہ کو

---

[۱] بالِ جبریل ص ۱۵۳

اتنا قوی کر دیتا ہے کہ وہ نفسِ امارہ پہ فتح یاب ہو کر انسان کی فلاح و بہبود کا باعث بنتا ہے۔ غرضیکہ انسان کا نجات دہندہ عشقِ الٰہی ہی ہے۔

(۵)

اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری
میراثِ مسلمانی سرمایۂ شبیری [1]

علامہ اقبال کے نزدیک دو قسم کے فقر ہیں۔ ایک فقر تو بہادر کو بزدل اور راہب بنا دیتا ہے اور دوسرا انسان میں شاہانہ تمکنت اور وقار پیدا کرتا ہے۔ حضرت حسین علیہ السّلام کا فقر دوسری قسم کے فقر کی زندہ مثال ہے۔ آپ کا فقر انسان کو سرداری عطا کر کے اسے عزت بخشتا ہے۔ یہی فقر مسلمانوں کے لیے سبطِ رسول کی طرف سے میراث قرار پایا ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ آپ کی سنت پہ عمل کر کے اثباتِ حق کے لیے اپنی جانیں بھی قربان کر دیں۔ اللہ، رسولؐ اور دینِ اسلام سے والہانہ محبت ہی نواسۂ نبی صلعم کی متاعِ عزیز تھی۔ اور یہی متاعِ گرانمایہ مسلمانوں نے آپ سے ورثے میں پائی ہے۔ اب اگر وہ اس ورثے کو بحفاظت رکھیں تو اس کے باعث جہاں دنیا میں عزت پائیں گے وہاں عقبیٰ میں بھی سرخرو ہوں گے۔

---

[1] بالِ جبریل صـ ۲۱۳

(۱)

قلندر میل تقریرے ندارد
بجز ایں نکتہ اکسیرے ندارد
ازاں کشتِ خرابے حاصلے نیست
کہ آب از خونِ شبیرے ندارد [1]

درویش صفت انسان کبھی لچھے دار تقریر کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنے دامن میں سوائے ایک نکتے کے اور کچھ بھی نہیں رکھتا۔ وہی نکتہ درحقیقت اکسیر ہے۔ وہ تو فقط اسی قدر جانتا ہے کہ زمینِ شور اور ویرانے کی کھیتی اس وقت تک قطعی طور پر پیداوار نہیں دے سکتی جب تک کہ اسے خونِ شبیرؑ سے سیراب نہ کیا جائے۔

علامہ اقبالؒ کا خیال ہے کہ اُمتِ مسلمہ دینی اقدار کو ہاتھ سے کھو بیٹھی ہے۔ اس کی مثال زمینِ شور اور ویرانے کی سی ہے کہ جہاں تخم ریزی فعلِ عبث سمجھی جاتی ہے۔ اُمتِ مسلمہ کی اخلاقی اور دینی کھیتی بھی سوکھی ہوئی ہے اور اس وقت تک سر سبز نہیں ہو سکتی اور نہ ہی پیداوار دے سکتی ہے جب تک کہ مسلمان اسے حضرت حسین علیہ السلام کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اپنے خون سے سیراب نہ کریں۔ سبطِ رسول کی سنت پر عمل ہی اس امت کو غلامی کے چنگل سے آزاد کرا سکتا ہے۔ مالکِ حقیقی سے

---

[1] ارمغانِ حجاز از اقبال ص۲۱

عشق رکھنے والا انسان اس نکتہ کو سمجھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ دانشور تقریروں کے سننے کی طرف میلانِ طبع نہیں رکھتا۔ وہ تو اسے فعلِ عبث سمجھتا ہے اور نواسۂ رسول صلعم کی سنت پر عمل ہی کو باعثِ نجاتِ امت قرار دیتا ہے۔ اس رباعی میں علامہؒ خود کو "قلندر" قرار دے کر مسلمانوں کو نصیحت کر رہے ہیں کہ وہ قیل و قال، بحث و مباحثہ، تقریر و تحریر سب کو چھوڑ کر دینِ اسلام کے اصولوں کی حفاظت کے لیے اپنی جانوں کی قربانی پیش کریں تاکہ اسلام زندہ ہو اور وہ دنیا و عقبیٰ کی فلاح و بہبود حاصل کر سکیں۔

(۲)

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

تاریخِ اسلام شاہد ہے کہ مسلمانوں کو نام نہاد تصوف سے بے حد نقصان پہنچا ہے۔ چنگیز و ہلاکو کی تاخت و تاراج نے مسلمانوں کے حوصلے بھی پست کر دیے۔ ان میں سے بعض نے مے خواری کے دامن میں پناہ لی۔ بعض نے ترکِ دنیا میں فلاح کی صورت پائی اور بعض نے غلامی پر ہی صبر اختیار کیا۔ غرضیکہ مسلمانوں میں بہادری کے اوصاف مفقود ہو کر رہ گئے۔ علامہ اقبال اس تصوف سے متنفر ہیں جو مسلمانوں کو

ا ارمغانِ حجاز صد ۲۶۲

جرأت سے عاری، عمل سے بے گانہ اور جد وجہد سے محترز بنا دے۔ وہ خانقاہی فقر اور رہبانیت کو اسلامی شعار کے منافی قرار دیتے ہیں۔ سچ بھی یہی ہے کہ اسلام ترکِ دنیا نہیں سکھاتا۔ اس سچے دین میں رہبانیت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ عزلت نشینی محمود نہیں بلکہ مذموم قرار دی گئی ہے۔ خانقاہوں میں "اللہ ہُو" کے نعرے نہ تو فردِ واحد کی نجات کے ضامن ہو سکتے ہیں اور نہ ہی جماعت، قوم اور اُمّت کی فلاح کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ علامہ کے نزدیک خانقاہیں اُمّتِ مسلمہ کے لیے مضرت رساں ہیں۔ وہ تو مسلکِ شبیری کے دلدادہ ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان خانقاہوں کو چھوڑ دیں اور عمل کی دنیا میں قدم رکھ کر حضرت حسین علیہ السّلام کی سنّت پر چلیں اور اپنی جانوں کی قربانیاں دے کر اُمّت کی فلاح کا ذریعہ بنیں۔ اس شعر میں وہ ایک مسلمان کو یہی مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ دین اسلام کے اصولوں کی حفاظت کے لیے سبطِ رسول کے نقشِ قدم پر چلے اور اپنی جان کی قربانی دے کہ دینِ حق کو بامِ عروج پر پہنچائے۔

---

(۱)

جس طرح مجھ کو شہیدِ کربلا سے پیار ہے
حق تعالیٰ کو یتیموں کی دعا سے پیار ہے

علامہ اقبالؒ اس شعر میں حضرت حسین علیہ السّلام سے والہانہ محبت کا اظہار

لہ باقیاتِ اقبال ص۵۷

فرما رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جیسا پیارا انھیں سبطِ رسول صلعم سے ہے اسی نوعیت کی محبت اللہ تعالےٰ کو یتیموں کی دعا سے ہے۔ پیچ ہے یتیم اللہ تعالےٰ کو اس قدر پیارا ہوتا ہے کہ اس کی دعا کے استقبال کے لیے اجابت درگاہِ باری تعالےٰ سے آتی ہے۔

(۲)

رونے والا ہوں شہید کربلا کے غم میں مَیں
کیا دُرِ مقصد نہ دیں گے ساقیٔ کوثر مجھے [۱]

حضرت امام حسین علیہ السلام معنیٔ ذبحِ عظیم اور سبطِ رسول صلعم ہیں۔ آنحضور صلعم نے فرمایا ہے کہ "حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں"۔ علامہ اقبال حضرت حسین علیہ السلام سے انتہائی محبت رکھتے ہیں۔ آپ کی راہِ حق میں قربانی بے مثال تھی۔ آپ پر اربابِ باطل نے بڑا ظلم کیا۔ آپ کو، آپ کے اعوان و انصار کو، آپ کے اعزّہ و اقربا کو اور آپ کی اولاد کو قتل کیا، ان کی لاشوں پہ گھوڑے دوڑائے اور پسماندگانِ مخدراتِ عصمت اور بچوں کو گرفتار کر کے بے کجاوہ اونٹوں پہ دمشق تک لے گئے۔ اقبال قلبی محبت اور رقت سے مجبور ہو کر آپ کے غم میں آنسو بہاتے ہیں اور اس ہمدردی اور مودّت کا اجر یہ چاہتے ہیں کہ رسولِ مقبول صلعم انھیں دنیا و عقبیٰ میں اپنی شفاعت سے نوازیں۔ دنیا میں ان کی شفاعت یہ کہ وہ دنیاوی زندگی میں کامران و کامگار رہیں اور اُخروی شفاعت یہ کہ عقبیٰ میں ابتلا سے نجات پاکر سرخرو ہوں۔

---

[۱] ... اقبال ... ۵۷

پایانِ کتاب

ھَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۝ (سورۃ الرحمٰن)

(نہیں بدلہ احسان کا مگر احسان)

اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد واجب الاذعان ہے کہ نیکی کا بدلہ نیکی سے اور احسان کا بدلہ احسان سے دیا جانا چاہیئے۔ چنانچہ جن مصنفین و مولفین کی کتابوں سے میں نے بالواسطہ یا بلا واسطہ استفادہ کیا ہے، انھیں اپنا محسن تسلیم کرتے ہوتے باری تعالیٰ کے حضور میں دست بدعا ہوں کہ وہ قادرِ مطلق و برتر ذاتِ ستودہ صفات ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ عین صواب ہوگا اگر میں اُن کتابوں کے کاتبوں، طبع کرنے والوں اور ناشروں کا بھی شکریہ ادا کروں جو ان کی اشاعت کا ذریعہ بنے۔

میں محکمۂ تعلیم، مغربی پاکستان کے اربابِ بست وکشاد کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے مجھے اس کتاب کے لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ نیز شیخ نیاز احمد صاحب کا احسان مند ہونا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں جنھوں نے نشر و اشاعت کا بار اپنے کندھوں پہ لے کر میری معاونت کی۔

میں اپنے فرض سے کوتاہی کروں گا، اگر اپنے ان تمام احباب کا شکر گزار نہ ہوں جنھوں نے میری ہمت افزائی فرمائی۔ اس سلسلے میں آقائے محترم پروفیسر ڈاکٹر سید وزیر الحسن عابدی، محترم پروفیسر سید علی اختر زیدی، آقائے مکرم پروفیسر ڈاکٹر محمد شجاع ناموس، مکرم پروفیسر چودھری غلام احمد حریری، آقائے بزرگوار پروفیسر چودھری نذیر احمد، بزرگوار پروفیسر محمد دلشاد کلانچوی، پروفیسر محمد اکبر، پروفیسر سید مختار حسنین طاہر، پروفیسر محمد اسحٰق جلالپوری، پروفیسر سید اسد علی ادیب، پروفیسر قاضی نثار احمد انصاری اور پروفیسر محمد اسمٰعیل طائر خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں، جنھوں نے گرانقدر مشوروں سے بھی نوازا۔ لہٰذا میں ان سب اصحاب کا مرہونِ منت ہوں اور بارگاہِ الٰہی سے ان کے لیے عَلیَ القدرِ معاونت عطائے اجرِ جزیل کا مستدعی ہوں۔

مجھے ان احباب کا بھی ممنون ہونا چاہیے جن کی قولی رکاوٹوں نے میرے جذبہ و شوق کو مہمیز کیا اور اس طرح میری حوصلہ افزائی کا سبب بنے۔

اللہ تعالےٰ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کو بھی جزائے خیر دے کہ انھوں نے مدحتِ اہلِ بیت اطہار علیہم السلام کو اپنا شعار بنائے رکھا، اور مسلمانوں کو ان کی سنت پر چلنے کی ہدایت کر کے ان کے لیے دنیا و عقبیٰ کی بہتری کا سامان فراہم کیا۔

اللہ تبارک و تعالےٰ کا عمیم احسان اور بے حد فضل و کرم ہے کہ اس ذاتِ ستودہ صفات نے میری اس اوّلین کوشش کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ میں نے جو کچھ لکھا، اسی قادرِ مطلق ہستی کی خوشنودی کے لیے لکھا ہے۔

اور اسی کی بارگاہ سے جزائے خیر فی الدارین کی عطا کا طالب و راجی ہوں
میں اپنے والدین کے لیے بھی جنابِ الٰہی سے فضل و رحمت کا طالب ہوں
جن کی تربیت نے مجھے اس قابل بنایا۔ میں حافظ کے اس قول کو دلنشین
کر چکا ہوں کہ؎

آسائشِ دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

چنانچہ میں نے یہی کوشش کی ہے کہ میرے قلم سے کسی انسان کا دل نہ
دکھے۔ تاہم نازک طبع احباب سے معذرت خواہ ہوں کہ کہیں میری کسی
جنبشِ نوکِ قلم نے ان کے لیے سامانِ گرانی نہ پیدا کر دیا ہو۔ میں نے
ہر روایت کو حتی المقدور درائت کی کسوٹی پر پرکھ کر وہی سپردِ قلم کیا جو میرے
نزدیک درست قرار پایا۔ میں علامہ اقبال کا ہمنوا ہوتے ہوئے تمام مسلمانوں
سے درخواست کروں گا کہ وہ اہل بیت اطہار علیہم السلام کے اسوۂ حسنہ
پر عمل پیرا ہو کر دنیا میں عزت اور عقبیٰ میں سرخروئی حاصل کریں۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

محبِ اہل بیت اطہار علیہم السلام
سید محبوب علی زیدی
۱۸ ردسمبر ۱۹۶۴ء بروز جمعۃ المبارک

کتابیات

۱- قرآنِ مجید

۲- قرآنِ کریم چہار ترجمہ
ترجمۂ اوّل (فارسی) از شیخ سعدی شیرازیؒ مع شانِ نزول بزبان فارسی از سعدی شیرازیؒ
ترجمۂ دوم (فارسی) از مولانا شاہ ولی اللہؒ
ترجمۂ سوم (اردو) از مولانا شاہ رفیع الدینؒ
ترجمۂ چہارم (اردو) از مولانا شاہ عبدالقادرؒ

۳- قرآن کریم مع ترجمہ و تفسیر بر حاشیہ از مولانا محمود الحسنؒ و شبیر احمد عثمانیؒ

۴- قرآن کریم مع ترجمہ از مولانا فیروز الدین صاحبؒ

۵- تفسیر ابن کثیر (اردو ترجمہ)

۶- تفسیر حسینی (فارسی) از ملا حسین کاشفی

۷- تفسیر بیان القرآن از مولانا سید اشرف علی شاہ تھانویؒ

۸- تفسیر موضح القرآن از مولانا سید عبدالقادر شاہ دہلویؒ

۹- تفسیر حقانی از ابو محمد عبدالحق حقانی دہلویؒ

۱۰- مرآت العارفین از سید العارفین حضرت امام حسین علیہ السلام (اصل عربی و اردو ترجمہ)

۱۱- صحیح بخاری از ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری (تجرید البخاری مع اصل عربی و اردو ترجمہ)

۱۲- ترمذی شریف از ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذیؒ (اردو ترجمہ)

۱۳- مشکوٰۃ المصابیح از امام ابومحمد حسین بن مسعود بغویؒ (اردو ترجمہ)

۱۴- مشارق الانوار از مولانا رضی الدین حسن صنعانیؒ (اردو ترجمہ)

۱۵- ریاض السنہ از محمد جعفر شاہ ندویؒ

۱۶- تُنک النجاۃ فی الامامۃ والصلواۃ از مولوی حافظ علی محمدؒ

۱۷- سیرت از عبدالملک ابن ہشامؒ (اردو ترجمہ)

۱۸- زادُ المعادُ از حافظ ابن قیمؒ (اردو ترجمہ)

۱۹- ارشاد القلوب از ابومحمد حسن بن ابی الحسن محمد دیلمیؒ (اردو ترجمہ)

۲۰- ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء از شاہ ولی اللہؒ (اردو ترجمہ)

۲۱- رحمۃ للعالمین از قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوریؒ

۲۲- سیرۃ النبیؐ از علامہ شبلی نعمانی

۲۳- حیاۃ محمد صلعم از محمد حسین ہیکل مصری (اردو ترجمہ)

۲۴- الزہراؑ از عمر ابوالنصر (اردو ترجمہ)

۲۵- الحسینؑ از عمر ابوالنصر (اردو ترجمہ)

۲۶- شہید اعظم علیہ السلام از مولانا ابوالکلام آزاد

۲۷- الفاروقؓ از مولانا شبلی نعمانیؒ

۲۸- تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی

۲۹- تاریخ اسلام از رشید اختر ندوی

۳۰- تاریخ اشاعت اسلام از شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

۳۱- اشاعت اسلام از محمد حبیب الرحمٰن صاحب ناظم دارالعلوم دیوبند

۳۲- اسرارِ خودی (فارسی) از اقبالؒ

۳۳- رموزِ بے خودی (فارسی) از اقبالؒ

۳۴- پیامِ مشرق (فارسی) از اقبالؒ

۳۵- بانگِ درا (اردو) از اقبالؒ

۳۶- زبورِ عجم (فارسی) از اقبالؒ

۳۷- جاوید نامہ (فارسی) از اقبالؒ

۳۸- بالِ جبریل (اردو) از اقبالؒ

۳۹- ضربِ کلیم (اردو) از اقبالؒ

۴۰- ارمغانِ حجاز (فارسی۔ اردو) از اقبالؒ

۴۱- باقیاتِ اقبالؒ از سید عبدالواحد معینی

۴۲- روحِ اقبال از ڈاکٹر یوسف حسین خاں

۴۳- اقبالؒ کامل از مولانا عبدالسلام ندوی

۴۴- سیرتِ اقبالؒ از پروفیسر محمد طاہر فاروقی

۴۵- تلمیحاتِ اقبالؒ از سید عابد علی عابد

۴۶- اقبالؒ اور عشقِ رسولؐ از رئیس احمد جعفری

تمّت بالخیر

بعونِ اللہِ تبارک و تعالیٰ

اقبالیات

بال جبریل قیمت -/۴

جاوید نامہ قیمت -/۵

مثنوی پس چہ باید کرد مع مسافر قیمت ۲/۵۰

سرودِ رفتہ ۔ مرتبہ غلام رسول مہر، صادق علی دلاوری
علامہ اقبال کا وہ کلام جو ان کے مرتب کردہ دواوین میں شامل نہ ہو سکا
نادر تحریروں کے عکس ۔ سائز ۸½ × ۶¾ ضخامت ۳۱۲ صفحات
طباعت آفسٹ ۔ قیمت -/۸

اقبال قرآن کی روشنی میں ۔ قاضی محمد ظریف ایم ۔ اے
قرآن حکیم کی روشنی میں کلام اقبال کا تجزیہ
ضخامت ۲۶۸ صفحات ۔ قیمت -/۶

رموزِ اقبال ۔ ڈاکٹر میر ولی الدین
تعلیمات اقبال کا مطالعہ ایک اچھوتے انداز میں
سائز ۵" × ۷½" ضخامت ۱۹۲ صفحات
قیمت ۲/۱۵

شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۔ پشاور ۔ حیدرآباد ۔ کراچی

اقبال اور عشقِ رسولؐ ۔ رئیس احمد جعفری

اقبال کا مطالعہ ایک نئے اور انوکھے زاویے سے

سائز ۵ × ۷½ ۴۰۰ صفحات قیمت ۶/۷۵

اقبال کی پیش گوئیاں ۔ ڈاکٹر ہاشمی

اقبال ملتِ اسلامیہ کے تخیلی احیاء کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس نے دنیا کے اہم ترین حالات و رجحانات اور عامۃ المسلمین کے متعلق خوش آئند پیش گوئیاں کی ہیں اور ایسے ایسے اشارات کیے ہیں جو ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

سائز ۸½ × ۶½ ضخامت ۱۶۰ صفحات قیمت ۳/-

اقبال اپنے آئینے میں ۔ سید رئیس احمد جعفری

اقبال کی شخصیت و کردار ان کے اشعار سے۔

ضخامت ۴۰۰ صفحات قیمت ۷/-

عرفانِ اقبال ۔ صاحبزادہ بشیر مخفی

علامہ مرحوم کے اسلامی تصوف، خودی، اجتماعیت و انفرادیت پر سیر حاصل تبصرہ سائز ۸½ × ۶½ صفحات ۲۹۶

کتابت و طباعت عمدہ، رنگین ڈسٹ کور قیمت ۳/-

اشاراتِ اقبال ۔ عبدالرحمن طارق بی۔ اے

جس میں حکیم الامت علامہ اقبال کی اردو تصنیفات میں سے جملہ اشارات و تلمیحات کو ہر جہت سے مکمل و مفصل صورت میں حل کیا گیا ہے۔ ۳/۵۰

مولانا غلام رسول مہر کے قلم سے کلامِ اقبال کی شرح

مطالبِ بانگِ درا

سائز ۸½ × ۶¾ ضخامت ۳۴۴ صفحات قیمت -/۶

مطالبِ بالِ جبریل

سائز ۸½ × ۶¾ ضخامت ۲۱۸ صفحات قیمت -/۵

مطالبِ ضربِ کلیم

سائز ۸½ × ۶¾ ضخامت ۲۰۰ صفحات قیمت -/۳

مطالب اسرار و رموز

سائز ۸½ × ۶¾ ضخامت ۲۹۶ صفحات قیمت -/۵

شعری ادب

ریاضِ رضواں - تہذیب: رئیس احمد جعفری

مرتب: سید نیاز احمد مرحوم

لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی کا مجموعہ کلام جو قصائد، غزلیات، رباعیات، قطعات اور جملہ انواعِ سخن پر مشتمل ہے۔

بڑا سائز، ۷۳۲ صفحات

کتابت و طباعت دیدہ زیب اور جاذب نظر قیمت -/۱۵

شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور - پشاور - حیدرآباد - کراچی

کلیات حسرت موہانی - حسرت موہانی

مولانا حسرت موہانی کا تمام کلام ایک ہی جلد میں
سائز ۳/۴ ۷ × ۱/۲ ۸ ۳۱۲ صفحات - رنگین گرد پوش قیمت -/۸

نشاطِ رفتہ - ڈاکٹر عندلیب شادانی

نشاطِ رفتہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی شگفتہ غزلوں، رسیلے گیتوں اور نشیلی نظموں کا دلفریب مجموعہ، جیسے بکھرے ہوئے آسمان پر سحر آفریں قوس و قزح کی تحریریں ہوں۔
رنگین اور دل کش ڈسٹ کور۔ عمدہ کتابت و طباعت قیمت -/۷

دیوان حافظ شیرازی

جس کے لیے پرستارانِ حافظ مدت سے تلاشی تھے۔ نہایت ہی خوبصورت طباعت اور گٹ اپ کے ساتھ۔
ضخامت ۱۸۴ صفحات قیمت ۳/۵۰

دیوانِ جوہر - مرتبہ نور الرحمٰن

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کا مجموعہ کلام جس میں ان کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے کلام کا عکس بھی شامل ہے۔
بڑا سائز، ۱۷۰ صفحات۔ عمدہ طباعت بہترین کارٹریج قیمت -/۱۰

طیورِ آوارہ اختر شیرانی قیمت ۳/۵۰

اختر ستان قیمت -/۳

لالۂ طور	اختر شیرانی	قیمت	-/۳
صبح بہار	"	قیمت	-/۳
انتخاب تاریخ	مرتبہ سید مرتضیٰ حسین	قیمت	۱/۵۰
ذوق	"	قیمت	-/۱
آتش	"	قیمت	۱/۵۰

تاریخ و سیاست

تاریخ فرشتہ۔ تالیف: ملا محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ

ترجمہ: عبدالحی خواجہ

مسلم عہد کی عظیم تاریخی داستان کا مستند اور معرکتہ الآرا مرقع، ضخیم اور لازوال تصنیف کا عام فہم، سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ غیر معروف اور مشہور مقامات کی مکمل و جامع تشریح، جامع اور واضح حواشی سے مزین۔ طباعت و کتابت نہایت ہی خوبصورت اور دیدہ زیب۔

سائز $9\frac{1}{2} \times 5\frac{1}{2}$ دو جلدوں میں مکمل قیمت -/۴۰

تاریخ شام۔ تصنیف: فلپ کے حتی

ترجمہ: غلام رسول مہر

دورِ قدیم سے دورِ حاضر تک اہلِ شام کی ایک مسلسل داستان، یہودیت اور نصرانیت کے نشو و ارتقا کی مکمل سرگزشت، متعدد

خاکے اور جامع و واضح حواشی سے مزین - سائز ۱/۲ ۷ × ۱۰

کتابت و طباعت نہایت ہی عمدہ اور جاذب نظر -

ضخامت ۵۵۲ صفحات قیمت -/۲۱

تاریخ لبنان - تصنیف : فلپ کے حتی

ترجمہ : غلام رسول مہر

عہد قدیم سے دور حاضر تک اہل لبنان کے مکمل و جامع حالات کا دلآویز مرقع - دنیا کے مہذب ملکوں کی تاریخ کا سرسری جائزہ، نایاب تصاویروں اور خاکوں سے مزین - نہایت ہی خوبصورت طباعت و کتابت -

سائز ۱/۲ ۶ × ۱۰ ضخامت ۵۰۴ صفحات - قیمت -/۱۵

منتخب التواریخ - تصنیف : ملا عبدالقادر ملوک شاہ بدایونی

ترجمہ : محمود احمد فاروقی

تاریخ مبارک شاہی اور نظام التواریخ کا صحیح انتخاب، محمود غزنوی سے عہد اکبری تک صحیح حالات اور تذکرے - تاریخی حقائق اور مستند ترین واقعات کا دلآویز مرقع - دیدہ زیب اور خوبصورت طباعت و کتابت -

سائز ۱/۲ ۷ × ۱۰ ضخامت ۸۷۸ صفحات

قیمت -/۱۵

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور - پشاور - حیدرآباد - کراچی

تاریخ اشاعتِ اسلام۔ تالیف: شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

عہد نبویؐ سے لے کر آج تک اشاعتِ اسلام کی مکمل و مستند تاریخ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی واحد و جامع تصنیف۔ کتابت و طباعت نہایت ہی عمدہ اور جاذبِ نظر

سائز ۱۰×۶½ ضخامت ۵۸۸ صفحات ۱۳/۵۰

ظہیر الدین بابر اور اُن کا عہد۔ مصنف: ولیم ارسکن

مترجم: حسین انور

ولیم ارسکن پہلے انگریز مورخ ہیں جنھوں نے بابر اور ان کے عہد پر ایک مستند کتاب لکھی ہے، یہ کتاب متعدد کتابوں کا نچوڑ ہے۔ اس سے قبل ایسی جامع و مکمل اور نادر و مستند کتاب منظرِ عام پر نہیں آئی۔ ضخامت ۵۶۸ صفحات، خوبصورت طباعت و کتابت، ڈسٹ کور رنگین اور دلکش۔

سائز ۶½×۱۰ ضخامت ۵۶۸ صفحات۔ قیمت ۱۳/۵۰

واجد علی شاہ اور ان کا عہد۔ رئیس احمد جعفری

واجد علی شاہ کی شخصیت، سیرت و کردار، وضع قطع، ان کی مجبوریاں، ان کی مظلومیت، اور ان کی زبوں بختی کے صحیح اور مستند واقعات کا مرقع نہایت ہی دلچسپ انداز میں۔

سائز ۱۰×۶½ ضخامت ۷۱۵ صفحات قیمت ۱۲/۵۰

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور۔ پشاور۔ حیدرآباد۔ کراچی

اور ہلاکت خیزیوں کی داستانیں - ہلاکو سے لے کر نادر شاہ کے مظالم
کی دردانگیز کہانی، دو رنگی تصاویر سے مزین
سائز ۹ × ½۵ ضخامت ۴۸۰ صفحات -/۷

عرس اور میلے - امان اللہ خاں سرحدی
پاکستان و ہند میں مدفون بزرگانِ دین کے عرسوں کی کیفیات اور اہم عوامی میلوں کے دلچسپ حالات و کوائف، پشاور، راولپنڈی، کیمبل پور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، لاہور، ملتان، بہاول پور، کراچی، پاک پٹن، قصور، بلوچستان، پانی پت، دہلی، سرہند، اجمیر، غرض پاک و ہند کے وسیع و عریض خطہ میں منائے جانے والے عرسوں اور میلوں کی تقریبات کا گراں بہا سرمایہ
سائز ۹ × ½۵ ضخامت ۳۰۴ صفحات ۶/۲۵

تاریخ تصوف اسلام - رئیس احمد جعفری
اردو زبان میں تصوف کی کوئی ایسی جامع و مانع تاریخ آج تک مرتب نہیں کی گئی جس میں تصوف کے عہد بہ عہد، عروج و ارتقا اور زوال و انحطاط کی مکمل اور مستند داستان سرائی کی گئی ہو
سائز ۵ × ½۷ ضخامت ۳۳۶ صفحات -/۵

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز
لاہور، پشاور، حیدرآباد، کراچی

نشانِ حیدری - تاریخ ٹیپو سلطان

تصنیف ، سر میر حسین علی کرمانی - ترجمہ محمود احمد فاروقی

نشانِ حیدری سلطان شہید کی شہادت کے صرف آٹھ سال بعد لکھی گئی - اس تذکرہ کے تمام حالات و واقعات چشم دید، مستند، مفصل اور جامع ہیں جو بلا کسی رنگ آمیزی کے قلم بند کئے گئے ہیں - اس کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اس کے بعد جس نے بھی سلطان ٹیپو پر کچھ لکھا، نشانِ حیدری کو ماخذ بنایا -

سائز ۱۰ × ۶ۛ½ ضخامت ۴۸۴ صفحات قیمت -/۱۰

تاریخ تہذیب - مرتبہ کرین رٹن ، رابرٹ ای ، ولف

ترجمہ و تحشیہ ، غلام رسول مہر

"تاریخ تہذیب" دنیا بھر کی مختلف تہذیبوں کا ایک دلآویز مرقع ہے ، ان اوراق میں کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کے ایک نامکمل ریکارڈ سے زیادہ کچھ نہیں ، اور وہ انسان ایک دوسرے سے مشابہ بھی ہیں اور مختلف بھی ، سائز ۱۰ × ½۷ ضخامت ۸۴۲ صفحات دو جلدیں مکمل - جلد اول -/۲۵

" دوم

دنیا کے ظالم حکمران - امان اللہ خاں سرحدی

جابر اور قاہر حکمرانوں کی خونریزی - قتل و غارت گری ، ظلم و تشدد

اور ہلاکت خیزیوں کی داستانیں - ہلاکو سے لے کر نادر شاہ کے مظالم
کی درد انگیز کہانی، دو رنگی تصاویر سے مزین
سائز ۵½ × ۹ ضخامت ۴۸۰ صفحات -/۷

عرس اور میلے - امان اللہ خاں سرحدی

پاکستان و ہند میں مدفون بزرگانِ دین کے عرسوں کی کیفیات اور
اہم عوامی میلوں کے دلچسپ حالات و کوائف پشاور، راولپنڈی،
کیمبل پور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، لاہور، ملتان، بہاول پور،
کراچی، پاک پٹن، قصور، بلوچستان، پانی پت، دہلی، سرہند،
اجمیر، غرض پاک و ہند کے وسیع و عریض خطہ میں منائے جانے
والے عرسوں اور میلوں کی تقریبات کا گراں بہا سرمایہ
سائز ۵½ × ۹ ضخامت ۳۰۴ صفحات ۶/۲۵

تاریخ تصوف اسلام - رئیس احمد جعفری

اردو زبان میں تصوف کی کوئی ایسی جامع و مانع تاریخ آج تک
مرتب نہیں کی گئی جس میں تصوف کے عہد بہ عہد، عروج وارتقا
اور زوال و انحطاط کی مکمل اور مستند داستان سرائی کی گئی ہو
سائز ۵ × ۷½ ضخامت ۳۳۶ صفحات -/۵

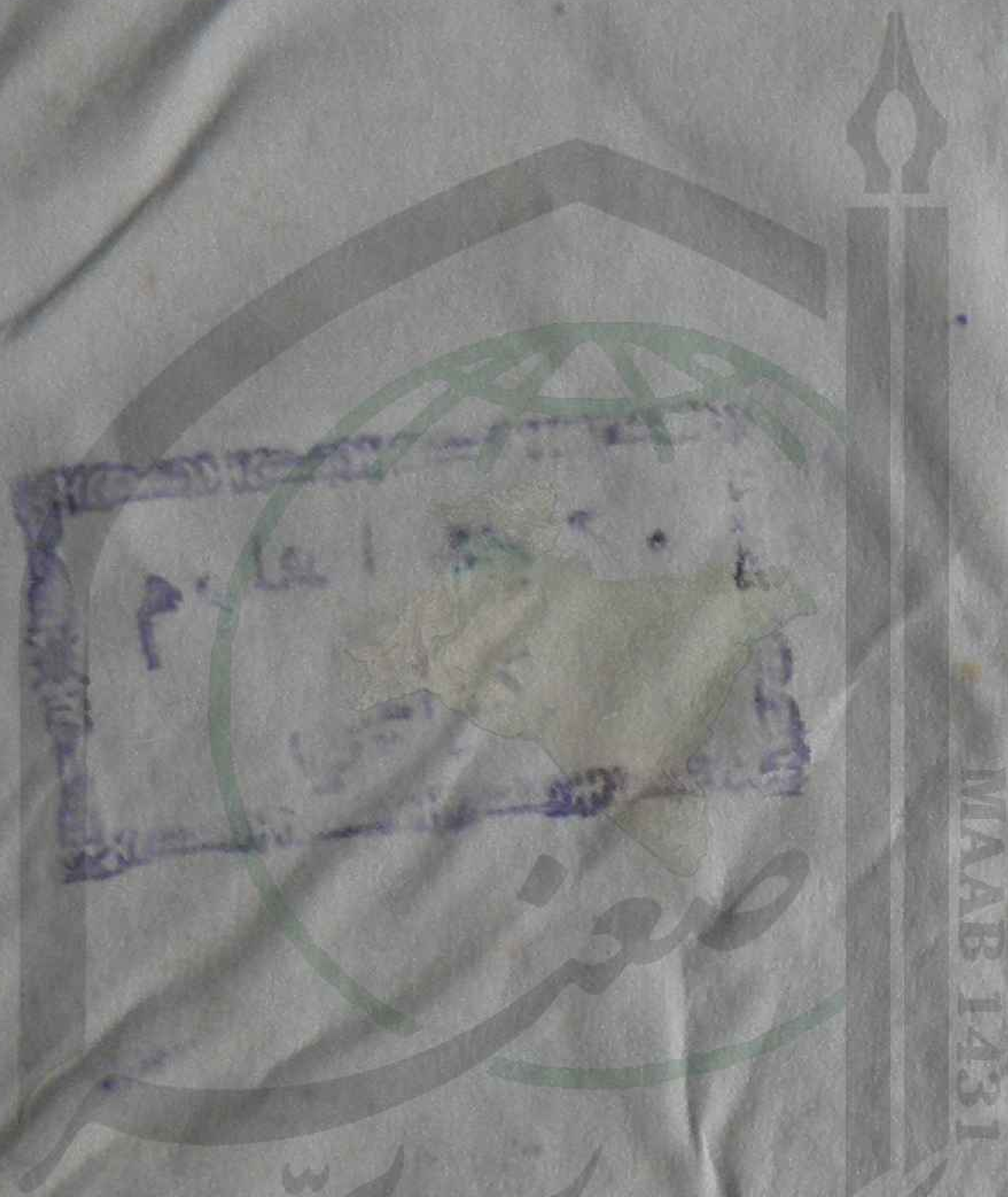
شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز
لاہور، پشاور، حیدرآباد، کراچی


MAAB 1431

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۷

جہاں غریب کو نان جویں نہیں ملتی
وہاں حکیم کے درس خودی کو کیا کہیے


MAAB 1431
maablib.org

